قبل از اسلام ہندوستان کی سماجی و مذہبی حالت اور اس کے اثرات

محمد شمیم اختر قاسمی ۞

ہندوستان اپنی قدیم تہذیب کا حامل خطہ ہے۔ اس خطے میں مسلمانوں کا داخلہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہوا، تاہم صحیح معنی میں یہ ظلمت کدہ سلطانی محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجاہدانہ مساعی سے روشن ہوا۔ اسلام کی آمد کے بعد اس خطے کی تاریخ بڑی زرخیز ہے، تاہم اسلام سے پہلے اس خطے کی تاریخ کا جاننا بھی اس اعتبار سے ضروری ہے کہ بعد کے حالات کی روشنی میں اس کا تقابل آسان ہو جائے۔ اس مقالے میں اسی پہلو پر خامہ فرسائی کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستان کی وجہ تسمیہ

مصر کے قدیم جغرافیہ داں لفظ 'ہند' کو 'سندھ' کے مشرقی علاقوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ 'ہند' سے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک بھی مراد لیے جاتے تھے۔ چناں چہ جب 'ہند کے بادشاہ' اور 'ہند کے علاقے' کہا جاتا تھا تو اس سے صرف 'ہند' ہی مراد نہ ہوتے تھے، بلکہ اس میں انڈونیشیا، ملایا وغیرہ بھی شامل سمجھے جاتے تھے اور جب 'سندھ' کہا جاتا تھا تو اس میں سندھ، مکران، بلوچستان، پنجاب کا کچھ حصہ اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ بھی شامل سمجھے جاتے تھے۔ ایسا کوئی ایک نام نہ تھا جس کا اطلاق پورے ہندوستان پر ہو۔ عربی اور فارسی میں ہندوستان کے جغرافیائی حالات بیان کیے جاتے تو اس میں 'ہند' اور 'سندھ' کے حالات شامل ہوتے تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کوئی نام ایسا نہ تھا جس کا اطلاق پورے ملک پر ہوتا ہو۔ اہل فارس نے جب اس ملک کے ایک صوبے پر قبضہ کر لیا تو اس دریا کے نام پر جسے اب 'سندھ' کہتے ہیں 'ہندو' رکھا، کیوں کہ ایران کی قدیم زبان پہلوی میں اور سنسکرت میں 'س' اور 'ہ' کو آپس میں بدل لیا کرتے تھے، چناں چہ فارسی والوں نے 'ہندھو' کہہ کر پکارا۔ عربوں نے 'سندھ' کو تو سندھ ہی کہا، لیکن اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو

۞ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک تھیالوجی، عالیہ یونی ورسٹی، کلکتہ۔
(mohdshamimakhtar.qasmi@yahoo.com)

'ہند' کہا اور آخر میں یہی نام تمام دنیا میں پھیل گیا۔ پھر 'ہ' کا حرف 'الف' میں بدل کر یہ نام فرنچ میں اند (Ind) اور انگریزی میں انڈیا (India) کی صورت میں مشہور ہو گیا اور درۂ خیبر سے آنے والی قوموں نے اس کا نام 'ہندو استھان' رکھا، جو فارسی تلفظ میں 'ہندوستان' کہا جانے لگا۔[۱]

ہندوستان کی جغرافیائی حالت

جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال میں ہمالیہ کی بلند چوٹیاں ہیں جو برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ اس کے تینوں ساحلوں پر قدیم زمانے ہی سے اہم بندرگاہیں تھیں جن کی وجہ سے ہندوستان کو بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کا موقع ملا۔ ان دریاؤں کے کنارے بتدریج بڑے بڑے خوب صورت شہر اور گاؤں آباد ہوئے جو تہذیب و تمدن کے مراکز بنے، جن میں بہت سے شہر اور گاؤں کی باقیات آج بھی موجود ہیں۔

پنجاب کے پانچ دریاؤں کی زرخیزی اور گنگا جمنا کے دو آبوں نے ہندوستان کو روایتی طور پر زرعی ملک بنا دیا۔ یہاں نہ صرف انواع و اقسام کے پھل پھول پیدا ہوتے ہیں، بلکہ یہاں کی سرزمین اپنے سینے میں مختلف النوع معدنیات اور جواہرات بھی چھپائے ہوئے ہے۔ اسی طرح یہاں مختلف قسم کے جانوروں کے ساتھ کئی قبلیوں سے تعلق رکھنے والے انسان بھی بستے ہیں، کیوں کہ صدیوں سے مختلف مذاہب کے لوگ دور دراز ملکوں سے آتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ ملک ایک ایسا گہوارہ ہے جس میں اختلافات میں بھی اتفاق اور نیرنگی میں بھی تمدنی ہم آہنگی اور یک جہتی پائی جاتی ہے۔ مگر بد قسمتی سے آزادی کے بعد یہاں کی پر امن فضا بتدریج مسموم ہوتی جا رہی ہے۔

ہندوستان کے قدیم باشندوں کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں سے آئے، کب آئے، کیوں آئے اور ان کا مورث اعلیٰ کون ہے؟ البتہ مختلف مقامات کی کھدائی کے دوران میں جو انسانی ہڈیاں، اسلحے اور اشیا دست یاب ہوئی ہیں ان کی تحقیق و تفتیش کے بعد علم الانسان کے ماہروں نے جو رائے قائم کی ہے اس کے پیش نظر مورخین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم باشندے شاید قدیم حجری[۲] عہد کے تھے،

۱۔ سید سلیمان ندوی، **عرب وہند کے تعلقات** (اعظم گڑھ: مکتبہ معارف، ۱۹۶۲ء)، ۱۲-۱۳ ؛ اردو دائرہ معارف اسلامی، شعبہ اردو، معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء، ۲۳، ص: ۱۷۳ ؛ فضل الرحمن (مدیر) **اردو انسائیکلوپیڈیا** (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، ۱۹۹۷ء)، ۳: ۴۳۰ ؛ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: علی احمد حکمت، **سرزمین ہند** (تہران یونی ورسٹی، ۱۹۵۹ء)، ۱: ۱-۱۱۔

۲۔ پتھر کے دور کے۔

جو وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔[۳] اس عہد کے آخر میں انسانوں کی بعض جماعتیں جنوبی ایران کے میدانی علاقوں سے گزرتی ہوئی بلوچستان اور سندھ کی راہ سے ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہوئیں۔[۴] غالب امکان ہے کہ انتقال مکانی کا سبب خورونوش کی اشیا کی تلاش وجست جو ہو۔ ان کے اندر تہذیبی شعور بھی بہ تدریج بڑھتا رہا۔ جدید حجری عہد (۱۰؍ہزار قبل مسیح سے ۵؍ہزار قبل مسیح) کے انسان کی جو باقیات دست یاب ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے ماقبل عہد کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ وہ اپنی رہائش کے لیے گھاس اور جھونپڑی کے گھروں کا استعمال کرتے، آگ روشن کرکے کھانا بناتے، مچھلی پکڑتے اور شکار کرتے، درختوں کے پتوں اور چھالوں سے ستر پوشی کرتے، اپنے مردوں کو دفن کرتے یا پھر جلادیتے اور درختوں کی پوجا کرتے تھے۔ یہ لوگ لمبوترے سر اور پست کھوپڑی والے تھے۔ وسطی اور جنوبی افریقہ، اسٹریلیا اور بحرالکاہل کے جزیروں کے لوگ جنوبی ہند کے قدیم اور اصل باشندے ہیں۔[۵] بعض علما کا خیال ہے کہ نئے پتھر کے زمانے کے لوگ پرانے پتھر کے زمانے والوں کی اولاد تھے۔[۶] اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ ان کی تہذیب دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاریخ کے متعدد علمانے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ڈراور لوگ ہندوستان کے قدیم ترین باشندوں کی اولاد تھے جو وقت کی رفتار کے ساتھ تہذیب کی سیڑھی پر چڑھتے گئے۔[۷]

ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب

سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں موہنجوڈارواور پنجاب کے ضلع منٹگمری میں ہڑپہ کی کھدائی کے دوران حیرت انگیز دریافتیں ہوئی ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں (پانچ ہزار سے تین ہزار قبل مسیح تک) یہاں کے باشندے تہذیب وثقافت اور معاشرت میں بلند معیار کے حامل تھے۔ رہنے سہنے کے لیے عمدہ اور نفیس مکان بناتے تھے، جس میں ضرورت بشری کے ہر پہلو کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ تعلیم وتعلم کا بھی رواج تھا۔ یہ لوگ مظاہر

۳۔ راما شنکر ترپاٹھی، **قدیم ہندوستان کی تاریخ** (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء)،: ۳ ؛ گستاولی بان، **تمدن ہند** (مکتبہ نذیریہ، س۔ن)،٦٦۔

۴۔ مرتضی احمد خاں، **تاریخ اقوام عالم** (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۸ء)،۱-۲: ٦۳۔

۵۔ نفس مصدر، ۹۱۔

٦۔ ترپاٹھی، **قدیم ہندوستان کی تاریخ**،۷۔۳

۷۔ نفس مصدر، ۳۹۔

فطرت کی عبادت کے ساتھ ساتھ ماتا دیوی کی پوجا بھی کرتے تھے۔ لنگ[۸] پوجا کا بھی رواج تھا۔ اپنے دیوتاؤں کے نام پر جانوروں کی قربانی کرتے تھے۔ سنگ تراشی اور مصوری میں وہ کمال رکھتے تھے۔ دھات اور لوہے کی مدد سے عمدہ اشیا اور اوزار بناتے تھے۔ اپنے مردوں کو جلانے کے بجائے دفن کرتے تھے۔ نیز ستر پوشی کے لیے کپڑوں کا استعمال کرتے تھے۔ کھیتی باڑی کر کے خورونوش کا انتظام کرتے تھے۔ زیادہ تر جو اور گندم کی کاشت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں آ کر ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب جو دور دراز علاقے میں پھیلی ہوئی تھی، نیست و نابود ہوگئی۔ اس تہذیب کے معدوم اور برباد ہونے کی کیا وجہ تھی؟ اس سلسلے میں مورخین کی آرا مختلف ہیں۔ ایک مورخ کی یہ راے قابل ملاحظہ ہے:

> آخر میں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی اس عظیم الشان تہذیب کا خاتمہ کس طرح ہوا؟ اس کے متعلق بھی کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ البتہ ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے جو زمینوں، سیڑھیوں یا دوسرے تنگ اور دشوار مقامات ملے ہیں وہ ضرور کسی ایسے حملے کی نشان دہی کرتے ہیں جس کے دوران بے چارے، بے بس اور لاچار مکیں افراتفری کے عالم میں جب جان بچانے کی آخری کوشش میں بھاگے تو ان مقامات میں پھنس کر رہ گئے اور وہیں جاں بحق ہوگئے۔ ایسی شہادتیں بھی ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی حملے کے نتیجے میں آتش زدگی کی وارداتیں پیش آئیں اور ظاہر ہے یہ حملہ آور آریہ نسل کے لوگ تھے اس قیاس کی تصدیق وید کی ابتدائی نظموں سے بھی ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آریوں کے حملوں کے علاوہ زمانہ کے دست وبرد، آندھیوں، طوفانوں، زلزلوں اور دوسری آسمانی بلاؤں کو بھی اس عظیم الشان تہذیب کی تباہی وبربادی میں ضرور دخل رہا ہوگا۔[۹]

آریہ کب اور کہاں سے آئے؟

ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب کے زوال کے بعد جو لوگ ہندوستان میں وارد ہوئے، عام طور سے انھیں آریہ کہا جاتا ہے، جس کے ایک معنی نیک اور شریف کے ہیں۔[۱۰] تقریباً دو ہزار قبل مسیح میں ایک بڑے میدانی علاقے (جو پولینڈ سے مرکزی ایشیا تک پھیلا ہوا ہے۔) سے ہجرت کر کے یہ لوگ ہندوستان آئے۔ مشہور ہندو لیڈر بال گنگا دھر تلک کا خیال ہے کہ وہ منطقہ باردہ سے ہندوستان آئے۔ جرمن پروفیسر میکس مولر ان کو وسط ایشیا کا باشندہ بتاتے ہیں۔[۱۱] ان کی آمد کا زمانہ ایک ہزار اور پندرہ سو قبل مسیح کے درمیان ہے۔[۱۲] بقول امیر علی "آریوں

۸۔ نفس مصدر، ۳۹۔

۹۔ سید سخی نقوی، **ہمارا قدیم سماج** (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، ۱۹۹۸ء)، ۱۰۔

۱۰۔ ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی، **قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں** (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۷۹ء)، ۱۰۳۔

۱۱۔ محسن عثمانی، **ہندو مذہب: مطالعہ اور جائزہ** (نئی دہلی: یونیورسل پیس فاؤنڈیشن ۲۰۰۱ء)، ۲۹۔

۱۲۔ گستاؤلی بان، **تمدن ہند** (کراچی: بک لینڈ، بندر روڈ، ۱۹۶۲ء)، ۱-۳: ۶۳۔

کی فتوحات کا سلسلہ ہندوستان میں صدیوں تک جاری رہا۔[۱۳] یہ لوگ طویل القامت، نسبتاً گورے اور زیادہ تر لمبے سر والے تھے۔"[۱۴] جتھے بناکر وہاں سے مغرب، جنوب اور مشرق کی طرف بڑھتے اور مقامی آبادی کو مغلوب کرتے رہے اور حکم ران طبقے کی تشکیل کی خاطر مقامی لوگوں سے ازدواجی رشتے بھی قائم کیے۔ جن جن مقامات پر وہ سکونت پذیر ہوئے رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی زبان کو مفتوح لوگوں کی زبان کے سانچے میں ڈھال لیا۔[۱۵] ابتدا میں یہ لوگ پنجاب میں قیام پذیر ہوئے۔ بعد میں مشرق کی طرف گنگ وجمن کے دوآبے میں داخل ہوئے، دھیرے دھیرے ہندوستان بھر میں پھیل گئے۔

خانہ جنگی کی ابتدا

آریہ جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہاں دراوڑ، کول اور منگول اقوام بڑی تعداد میں، چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور مختلف ٹکریوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یہ لوگ آریوں کی طرح جنگ جو، مفسد اور دغاباز نہ تھے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ تہذیبی شعور سے بھی ناآشنا تھے۔ آریوں نے طویل اقامت کے بعد اپنا اقتدار قائم کرنے اور یہاں کے باشندوں کو محکوم بنانے کے لیے جنگ وجدال کا بازار گرم کیا۔ جن لوگوں نے اس جنگ میں آریوں کا ساتھ دیا اور جنھوں نے آریوں سے جنگ کی اور مغلوب ہوئے ان کو مختلف ناموں سے پکارا گیا اوران کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا گیا جو بعد میں مجبور ہو کر ملک کے دوسرے حصوں میں جاکر آباد ہوگئے۔[۱۶]

مورخ اکبر شاہ نجیب آبادی لکھتے ہیں:

> اول پنجاب پر آریوں کا قبضہ ہوا اور غیر آریا مشرق وجنوب کی طرف دھکیل دیے گئے۔ پھر مشرق کی طرف بڑھتے گئے، وادی ستلج تک پہنچ کر رگ وید کی تصنیف شروع ہوئی۔ آخر میں بہار وبنگال تک پہنچ گئے۔ غیر آریہ کچھ مقتول ہوئے کچھ گرفتار، کچھ پہاڑوں اور جنگلوں میں جاچھپے اور قزاقانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ملک دکن کی طرف چوں کہ شمالی ہند کے بعد آریوں کا حملہ ہوا ہے، جب کہ شمالی ہند کے بچے ہوئے غیر آریا بھی دکن ہی کی طرف چلے گئے تھے۔ غلاموں اور خدمت گاروں کا چسکا بھی آریوں کو لگ چکا تھا، لہٰذا اب بجائے قتل کے محکوم اور غلام بناکر زندہ رکھنے کو ترجیح دی جاتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ دکن میں غیر آریہ قومیں بمقابلہ شمالی ہند کے زیادہ آباد ہیں۔ ان غیر آریاؤں کا نام وید میں اسور، داسو، دیسو، ڈشٹ وغیرہ رکھا گیا ہے۔[۱۷]

۱۳۔ سید امیر علی، **روح اسلام** (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۸ء)، ۱۱۔

۱۴۔ سید ابو ظفر ندوی، **مختصر تاریخ ہند** (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۷۸ء)، ۵۔

۱۵۔ مرتضیٰ احمد، **تاریخ اقوام عالم**، ۱۸۰۔

۱۶۔ ترپاٹھی، **قدیم ہندوستان کی تاریخ**۔

۱۷۔ اکبر شاہ نجیب آبادی، **وید اور اس کی قدامت** (مطبوعہ لکھنؤ، س۔ن)، ۱۳۔

ویدک عہد میں مذہب

رگ وید کے دور میں مذہبی عقائد بھی سماج کی طرح پیچیدہ نہیں تھے۔ وہ قدرت کے مظاہر اور دیوتاؤں کی پرستش کرتے جو زیادہ تر مذکر ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ ہر دل عزیز دیوتا 'اندر' تھا جو بھوت پریت کے خلاف لڑتا تھا، جنگوں میں فتح حاصل کرنے کے لیے لازمی طور پر اس کی عبادت کی جاتی، ہوا کا دیوتا 'ورن' دوسرے نمبر پر تھا وہ قدرتی نظام کو برقرار رکھنے والا تھا۔ 'سوریا' اور 'سوم' پودوں کا دیوتا تھا۔ 'بشان' چرواہوں، گلہ بانوں اور مویشیوں کا محافظ تھا۔ آگ کی دیوی 'اگنی' عام لوگوں کے گھروں میں ہوتی تھی جو دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیان رابطہ کا کام انجام دیا کرتی تھی۔ اگرچہ غیر آریائی مذہبی عقائد کی صاف طور سے نشان دہی نہیں کی جاسکتی لیکن ان کے دیوتا ریودا (Tvaahtsi) وغیرہ تھے۔ آریاؤں کے سارے عقائد جن کے خدوخال ابتدائی ہند کے مذہبی عقائد سے ملتے جلتے تھے، بتدریج مقامی مذہبی اثرات کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ اس طرح رگ وید میں سماج کا خصوصی کردار قدرت کے مظاہر کی پرستش کے ارد گرد گھومتا ہے۔[۱۸] بھگوت گیتا کے اردو مترجم ویدک عہد کے مذہب کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> آریہ اپنے دیوتاؤں کی والہانہ پرستش کرتے تھے اور مختلف مظاہر قدرت کو خدا کی مختلف صفات سمجھتے تھے، لیکن ان کے سادہ اور پاکیزہ قلوب میں کائنات کی مختلف قوتوں کی اپنی عظمت وشان سمائی ہوئی تھی کہ ان میں سے جب کسی ایک کی تعریف وپرستش کرتے تھے، تو اسی میں محو ہوجاتے تھے اور غیر کو فراموش کر دیتے تھے، بلکہ اسی کو سب دیوتاؤں سے بزرگ وبرتر مان کر پرستش کرتے تھے۔ ایسے بہت سے منتر وید میں ہیں، جن میں ہر ایک دیوتا کو واحد مطلق کی طرح بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً اندر کے متعلق ایک اشلوک میں کہا گیا ہے کہ: "اے اندر تیرے مرتبہ کو نہ انسان پہنچ سکتے ہیں نہ دیوتا۔" دوسرے بھجن میں سوم کو آسمان وزمین کا بادشاہ اور سب پر غالب بتایا گیا ہے۔ اسی طرح ورن کو کل آسمان اور زمین کا مالک اور سب انسانوں اور دیوتاؤں کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ ایک خدا کی مختلف صفات کی پرستش بھی کرتے تھے اور ایک خدا کا تصور ان کے ذہن میں موجود تھا۔[۱۹]

ان میں سے بہت سی مذہبی رسوم ایسی ہیں جن پر آج بھی ہندو عمل کرتے اور اس کو انجام دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان مذہبی رسوم کو اس انداز سے انجام نہیں دیا جاتا جس طرح کہ مذہبی کتابوں میں ان کے انجام دینے کا حکم ملتا ہے۔ ان تمام مذہبی رسوم کو انجام دینے کے لیے برہمن طبقہ موجود تھا، بلکہ یہ بات لازم ٹھہرائی گئی

۱۸۔ **تاریخ ہند** (عہد عتیق تا ۱۵۵۶ء) (نصاب برائے: بی۔ اے، سال سوم) (حیدر آباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی)، ۹۸۔

۱۹۔ محمد اجمل (مترجم) **بھگوت گیتا** (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۹ء)، ۱۷-۱۸۔

کہ مذہبی رسوم کو انجام دینے کے لیے ہر ایک کو چاہے وہ راجہ ہو یا مہاراج برہمنوں سے مدد حاصل کرنا ضروری ہے۔[۲۰] ان مذہبی رسوم کی نشان دہی رگ وید سے بخوبی ہوتی ہے۔ ابتدائی دور کے آریہ مورتی پوجا اور مندر کی ضرورت سے ناآشنا تھے۔ مورتی پوجا کا طریقہ آریوں نے قدیم باشندوں سے سیکھا۔[۲۱] جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کے یہاں دیوی دیوتاؤں کا اضافہ ہوا اور یہی حال مذہبی رسوم کے ساتھ ہوا۔ چاہے اس کا تعلق انسان سے ہو یا جانور سے، صحرا سے ہو یا دریا سے، آگ سے ہو یا پانی سے؛ ہر ایک کی پوجا شروع ہو گئی اور مذہب کی اصل روح مفقود ہو گئی۔

وید اور دیگر مذہبی کتابیں

آریہ رگ وید کی ترتیب و تدوین کے زمانے میں سرزمین پنجاب میں وارد ہوئے تھے۔ البتہ وید کے بقیہ حصے (یجروید، سام وید، اتھروید) انھوں نے گنگ وجمن کی وادی کے قیام کے دوران مدون کیے۔ یہ وید ہندوؤں کی نہ صرف مقدس کتابیں سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ان کے بارے میں اس بات کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ وحی الٰہی ہے جو رشیوں، منیوں پر مختلف اوقات میں نازل ہوئی۔[۲۲] اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی وہ اولین کتابیں ہیں جن کی مدد سے ہند آریہ کی تہذیب و معاشرت اور اس کے مذہبی عقائد کا تعین کرنا آسان ہو جاتا ہے کیوں کہ ان کے علاوہ ان کے پاس کوئی ایسی قدیم تاریخی کتاب نہیں جس سے قدیم عہد کے متعلق مثبت یا منفی نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔[۲۳] اس کتاب کے الہامی ہونے کا یقین نہ صرف ہندوؤں کو ہے بلکہ دیگر مذاہب کے علما و مفکرین کی بھی تائید حاصل ہے۔[۲۴]

چاروں ویدوں کے علاوہ ہندوؤں کے یہاں اور بھی دیگر مذہبی اور مسلکی نوعیت کی کتابیں پائی جاتی ہیں، جو وید سے کم تر درجے کی ہیں، البتہ مقدس مانی جاتی ہیں۔ ان مقدس کتابوں کی دو قسمیں ہیں: ایک شروتی جس کے معنی سننے کے ہیں، چاروں وید شروتی ہیں۔ دوسری قسم کی کتابیں اسمرتی ہیں جس کے معنی یاد کیے ہوئے کے ہیں۔ یہ وہ سچائیاں ہیں جن کا اظہار رشیوں، منیوں اور علما نے کیا۔ وید کے علاوہ تمام الہامی کتابیں اسمرتی ہیں۔ رگ وید سب سے پرانا وید ہے جو تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح مرتب ہوا۔ یہ بھجنوں پر مشتمل ہے اور نظم کی صورت میں ہے۔ اس کے

۲۰۔ پنڈت منوہر لال زتشی، **ہندو مذہب** (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۳۰ء)، ۲۱۔

۲۱۔ مرتضیٰ احمد، **تاریخ اقوام عالم**، ۱۸۱۔

۲۲۔ نفس مرجع، ص: ۱۷۸

۲۳۔ گستاؤلی بان، **تمدن ہند**، (دہلی)، ۱۴۶۔

۲۴۔ شاہ غلام علی دہلوی، **مقامات مظہری** (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۳ء)، ۴۹۸۔

دس ہزار منتر ہیں، جو دس منڈلوں میں منقسم ہیں۔ اس کا آغاز اگنی دیوتا کی تعریف سے ہوتا ہے۔ اگنی کی پوجا اور تعریف کے بعد اندر دیوتا کی مدح و تعریف کی گئی ہے۔ پھر سوم دیوتا کی حمد ہے۔ اس کے علاوہ اور دیوتاؤں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔

یجر وید سارے کا سارا رگ وید سے ماخوذ ہے۔ قربانیوں کے وقت اس کے منتروں کا جاپ کیا جاتا ہے۔ اس کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے: شکل یجر وید اور کرشن یجر وید۔ دوسرے حصے میں الہیات کی تعلیم ملتی ہے۔ **شکل وید** میں راگ اور گیت ہیں، جو **رگ وید** کے نصف کے برابر ہے۔ کئی منتر **رگ وید** سے لیے گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں اصلاً صرف ننانوے منتر ہیں۔ اس کے باقی منتر **رگ وید** سے ماخوذ ہیں۔

اتھر وید میں کل چھے ہزار منتر ہیں جو چوبیس بابوں میں منقسم ہیں۔ زیادہ حصے نثری ہیں۔ توحید، خدا، مخالفین سے سلوک اور عورتوں سے متعلق احکامات وید کی تعلیمات کا خلاصہ ہیں۔ اس میں قربانیوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور مورتی پوجا کا اشارہ بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہے۔

پھر ان ویدوں کے چار حصے ہیں: سنگھتا، یعنی منتر، براہمن، آرنیک اور اپنیشد۔

سنگھتا میں دیوتاؤں یا قدرتی طاقتوں کی حمد و ثنا ہے۔ ان کو گا کر آریہ لوگ دیوتاؤں کو خوش کرتے اور منھ مانگی مرادیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

براہمن وہ حصہ ہے جس میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے آگ میں ہون کر کے ان کو بہت سی کھانے پینے کی چیزوں دے کر یگیہ کیا کرتے تھے۔

آرنیک وہ حصہ ہے جس میں ان تصورات کا ذکر ہے جن پر آریہ لوگ جنگل میں جاکر زندگی بسر کرتے ہوئے غور و فکر کیا کرتے تھے۔

اپنیشد وہ آخری حصہ ہے جس میں آریہ لوگوں کے گہرے اور بلند ترین روحانی تجربات اور خیالات کا ذکر ہے جو انھیں گرو اور چیلوں کے درمیان مکالموں کے ذریعے حاصل ہوئے ہیں۔ [۲۵]

کچھ عرصے کے بعد لوگوں نے ویدوں کی تعلیمات کے زیر اثر ایسی تصانیف کیں جن میں ویدوں کے تصورات کی تعبیر کر کے آسان فہم زبان میں مذہبی خیالات کا اظہار کیا۔ یہ اٹھارہ کتابیں ہیں جن کو سمرتی کہا جاتا ہے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا لوگوں میں سمجھنے کی طاقت کم ہونے لگی اور ان کی ضروریات بھی کافی تبدیل ہو گئیں تو علمانے

۲۵۔ فضل الرحمٰن (مدیر)، **اردو انسائیکلوپیڈیا** (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۷ء)، ۳: ۴۳۔

ویدک دھرم کی اشاعت کے لیے تاریخ کی طرز کی کتابیں اور پران وغیرہ لکھنا شروع کیں، جن کے ذریعے زندگی میں ان مذہبی اصولوں کو عمل میں لانے کے طریقے بتلائے گے۔ راماین، مہابھارت، اٹھارہ بڑے پران اور اٹھارہ چھوٹے پران اسی مقدس مذہبی ادب کی عقلی طور پر تائید وتوضیح کرنے کے لیے لکھی گئیں۔ ان سب میں روحانی اور مذہبی تصورات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس طرح ہندوؤں کا تمام ادب مذہبی ہے، اس لیے کہ تمام کتابوں میں وید میں بتلائے ہوئے اصولوں پر زندگی میں کس طرح عمل کیا جاسکتا ہے، جیسے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔[۲۶]

ہندو مذہب کے اصول

اپنیشدوں کی تعلیم کے مطابق اس کائنات کی تہہ میں ایک روحانی وجود ہے جس سے تمام کائنات پیدا ہوئی ہے، اسی میں یہ کائنات موجود رہتی ہے اور اسی میں فنا ہو جاتی ہے، اس کو برہمہ کہتے ہیں۔ دنیا کی سب چیزیں اور روحیں اسی کا ظہور ہیں اور وہ سب کا حاکم اور پرورش کرنے والا ہے۔ اس طرح تمام کائنات روحانی ہے اور اس کو چلانے والا ایک خدا ہے اور چلا رہا ہے۔ اس میں بے حد طاقتیں موجود ہیں۔ قوت تخلیق کو 'مایا' یا 'پراکرتی' کہا جاتا ہے۔ اسی قوت یا شکتی سے وہ اپنے آپ کو برہمہ (خالق)، وشنو (پرورش کرنے والا اور قائم رکھنے والا) اور شیو (فنا کرنے والا) کی شکلوں میں ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے برہم، وشنو اور شیو یہ تینوں شکلیں ایک برہمہ کی ہی ہیں جو اس نے تین عظیم کام انجام دینے کے لیے اختیار کر رکھی ہیں۔ ہندو برہمہ کو تو سب سے بڑی اور سب جگہ موجود رہنے والی ہستی مانتے ہیں، لیکن بڑے دیوتا وشنو اور شیو کو بھی اسی طرح مانتے ہیں اور ان کی پوجا اور حمد وثنا کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے نام سے الگ الگ فرقوں میں منقسم بھی ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ برہمہ کو، کچھ وشنو کو اور کچھ شیو کو ہی سب سے بڑا دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا اور اس کی بھگتی کرتے ہیں۔ لیکن در اصل برہمہ ہی سب سے بڑا دیوتا ہے جس کی یہ سب شکلیں ہیں۔ چوں کہ برہمہ سب کی علت ہے اور ہر ایک چیز اس کا ظہور ہے، اس لیے انسان کی روح بھی برہمہ ہے۔ جیسے سونے سے بنے ہوئے تمام زیورات سونا ہی ہیں اور مٹی سے بنے ہوئے برتن مٹی ہیں، اسی طرح یہاں سب کچھ برہمہ ہی ہے۔[۲۷] قدرت کی جتنی طاقت ور چیزیں جیسے سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، سمندر، برف اور برسات وغیرہ ہیں ان سب میں برہمہ یا پرماتما کی طاقت کام کر رہی ہے اور ان سب کو دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ اس کائنات میں بہت سے طبقے ہیں اور ہر طبقے کے لیے مخصوص جائے مقام ہے۔ کچھ طبقے دیوتاؤں کے رہنے کے ہیں جن کو سورگ یا

۲۶۔ نفس مرجع، ۴۳۰-۴۳۱۔

۲۷۔ نفس مرجع، ۴۳۱۔

بہشت کہتے ہیں، کچھ طبقے نرک یا دوزخ کہلاتے ہیں، جہاں گنہگاروں اور برا کام کرنے والوں کو مرنے کے بعد رکھا جاتا ہے۔[۲۸]

مندر کی ابتدا اور مورتی پوجا کا رواج

قدیم زمانے میں ہندوستان کے باشندے نہ تو مورتی پوجا کرتے تھے اور نہ مندر سے واقف تھے۔ وہ لوگ اپنے خالق کی عبادت کرنے کے لیے مختلف دیوتاؤں کا سہارا لیے ہوئے تھے، جو سب کے سب مظاہر فطرت کے دیوتا تھے۔[۲۹] اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہندوؤں کے یہاں اس طرح کا تصور کیوں اور کب پیدا ہوا اور پھر مورتی پوجا کا رواج اور مندر کی تعمیرات کا سلسلہ کیسے شروع ہوا؟ اس سلسلے میں کچھ تفصیل مذاہب عالم سے موسوم گگن کے خصوصی شمارے میں ملتی ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

> قدیم آریہ قوم میں مندر کا رواج نہیں تھا، نہ گھر میں اور نہ گھر سے باہر۔ چوں کہ ابتدا میں آریہ ایک خانہ بدوش قوم تھی، اس لیے ان کی عبادت جغرافیائی حد بندیوں سے بے نیاز تھی۔ وہ جب چاہتے جہاں چاہتے، قربانی کی مذہبی رسم ادا کر کے عبادت کے فرض سے سبک دوش ہو جاتے تھے۔ مندر کی ابتدا کیسے ہوئی، اس کو کسی محقق نے وثوق سے نہیں بتایا، لیکن ایک مغربی اسکالر میڈیم سٹیلا کریم ریچ نے اتنا بتایا ہے کہ "تیرتھ" اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جس جگہ یاترا کی جاتی ہے۔ وہ جگہ عموماً کسی دریا یا جھیل کا کنارہ ہوتی تھی، یا کسی پہاڑ پر بنی کوئی جگہ۔ ایسی جگہوں پر جو عمارت بنی وہ مندر کہلائی۔
>
> ایک اندازے کے مطابق مندر آریوں سے پہلے کی چیز ہے، ہندوستان کے قدیم باشندوں کا خیال تھا کہ روحیں جنگلوں میں رہتی ہیں اور درختوں پر بسیرا کرتی ہیں۔ چناں چہ جب لوگ اپنی کھیتی باڑی کی ضرورت کے لیے ایندھن حاصل کرنے کے لیے جنگلات کاٹتے تو جنگل کا ایک چھوٹا سا حصہ چھوڑ دیتے تھے، تاکہ اس جگہ کے پیڑوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ روحوں کے لیے قیام کرنے کے کام آئیں اور تھوڑا بہت ٹھکانہ رہے۔ جنگل کے اس حصے کو وہ پانی دیتے اور اس کی دیکھ بھال کرتے تھے اور زندہ رکھنے اور درختوں کی سرسبزی برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے پھر ایک آدمی مقرر کر دیا جو اس علاقہ کا رکھوالا بھی ہوتا اور درختوں کی دیکھ بھال بھی کرتا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ روحوں کو خوش رکھ کر ہی وہ خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر ہر علاقہ کے جھنڈ کا ایک نگہباں بنایا گیا جو آگے چل کر پروہت بن گیا۔ ایک جھنڈ کو دوسرے سے الگ رکھنے اور پہچان کے لیے وہاں پر ایک مورت رکھ دی اور اسے ایک نام دے دیا گیا، لیکن جب کسی آسمانی آفت آندھی، سیلاب، طوفان سے یہ جھنڈ متاثر ہوتے تو ان کو دوبارہ بنانا بہت مشکل ہونے لگا، ان کو بچانے کی خاطر وہاں اینٹ پتھر سے چار دیواری بنا کر ڈھانک دیتے تھے۔ جنوبی ہند میں بعض مقامات پر اسی عمارت اور درختوں سے بعض مورتیاں نکلی ہیں۔

۲۸۔ نفس مرجع۔

۲۹۔ ہندوازم (محاضرہ علمیہ بہ سلسلہ ہندومت، منجانب: دارالعلوم دیوبند) ۳: ۴۷۔

چناں چہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی ان عبادت گاہوں کو آریا کی قوم نے اپنا رنگ دے کر باقاعدہ مندر کی شکل دے دی اور ایک کی جگہ کئی کئی مورتیاں رکھ کر مندروں کا انتظام خود سنبھال لیا، جب باقاعدہ عمارت بن کر تیار ہوئی تو عوام نے قربانی اور تمام مذہبی رسوم مندر میں آکر انجام دینے میں زیادہ سہولت محسوس کی، پھر ان مورتیوں کو خدا کی صفات کے نام دیے گئے اور عوام کی عقیدت ان کے تئیں اتنی ہوگئی کہ وہ اپنا مال و دولت، زمین جائداد ان کے نام کرکے آخرت کی خوشیاں حاصل کرنے لگے۔[۳۰]

ذات کی تقسیم، دائرہ کار اور نتیجہ

چاروں وید کی ترتیب و تدوین کے ایک لمبے عرصے کے بعد ان مقدس کتابوں کی توضیح و تشریح کی گئی تو اس کے اندر سماجی تقسیم اور ذات پات، مذہبی رسوم اور دیگر قوانین میں سختی برتی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سماجی تقسیم کی بنیاد رگ وید کے عہد کے اختتام پر کی گئی تھی اور سماج چار بڑے طبقات میں تقسیم ہو گیا تھا۔ طبقات کی اس چہار گانہ تقسیم کو مذہب کی منظوری بھی حاصل ہوگئی تھی اور اس کو بنیادی تصور کیا جانے لگا تھا۔ غالباً یہی چہار گانہ تقسیم بعد کے عہد میں بھی ہندوستان کے قدیم باشندوں کے لیے ناقابل قبول رہی، جس کے نتیجے میں بھیانک اور خوں ریز جنگ کی تفصیلات قدیم تاریخی کتب میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

برہمنوں نے سماج میں اپنی برتری جتانے کے لیے ان مقدس کتابوں میں ظاہر کیا کہ خدا نے جب دنیا کو پیدا کرنا چاہا تو سب سے پہلے برہما کو پیدا کیا۔ برہما کے منھ سے برہمن، بازو سے چھتری، زانوں سے ویش اور پاؤں سے شودر پیدا ہوئے۔[۳۱] اسی تقسیم کے مطابق مختلف ذاتوں کے کاموں کی بھی تقسیم کی گئی۔ منھ اور سر کا تعلق بولنے، کھانے پینے، سوچنے، غور کرنے اور سارے جسم کی رہ نمائی اور کنٹرول سے ہے، اس لیے ان کا بھی سماجی جسم میں وہی کام ہونا چاہیے۔ یعنی برہمن کا کام تعلیم و تدریس، علم، فلسفہ، مذہب کا حصول، تحائف قبول کرنا اور پورے سماج کی بااختیار رہ نمائی کرنا ہے۔ یہی نہیں منھ اور سر کا رتبہ سارے جسم میں تمام اعضا سے بلند ہے اس لیے برہمنوں کا مقام بھی سماج میں بلند ترین ہونا چاہیے۔ پھر بازوؤں کا تعلق سر اور منھ کے بعد آتا ہے اور بازو سے جسم کی حفاظت اور مدد کا کام لیا جاتا ہے اس لیے برہمنوں کے بعد چھتریوں کا رتبہ سماج میں سب سے اولیٰ ہونا چاہیے۔ اس طرح ان کا خصوصی کام سماج میں امن و امان قائم کرنا اور بیرونی حملے سے سماج کو محفوظ رکھنا مقرر رہا۔ کمر اور جانگھ اور پیٹ بازوؤں کے نیچے ہوا کرتے ہیں اور ان کا تعلق خوراک، ہاضمہ اور دوسرے اعضا کو زندگی کی طاقت پہنچانا ہے اس لیے

۳۰- **ماہ نامہ گگن، مذاہب عالم نمبر**، بمبئی (۱۹۸۴ء)، ۹۱۴-۹۱۵۔

۳۱- مرزا محمد حسن قتیل، **ہفت تماشا** (دہلی: مکتبہ برہان، دہلی، ۱۹۶۸ء)، ۲۵-۲۶۔

سماج میں تیسرا مرتبہ ویشوں کا ہونا چاہیے اور ان کی ذمے داری ہے کہ تجارت، صنعت، زراعت اور دوسرے طریقوں سے سماج کے معاشی نظام کو تقویت پہنچائیں، پھر پیر کا تعلق جسم کے سب سے نچلے حصے سے ہے اور سارا جسم پیروں پر کھڑا ہوتا ہے اس لیے شودروں کا مقام سماج میں سب سے پست ہے۔ ان کا خاص کام دوسری ذات والوں کو سہارا دینا اور ان کا بوجھ اٹھانا ہے۔[۳۲]

برہمن کو سماج میں اعلیٰ مقام دیا گیا، جس کے نتیجے میں وہ ہر قید و بند سے آزاد سمجھے گئے۔ جب کہ دوسری تمام ذاتیں بتدریج سماج میں پست درجے پر رہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں میں سخت مزاحمت ہوئی اور کافی عرصے تک جاری رہی۔ اس جنگ میں جن لوگوں نے آریوں کا ساتھ دیا اور مخالف گروہ سے جنگ کی، برہمنوں نے اسے چھتری اور محافظ قرار دیا اور حکومت کی باگ ڈور انھی کے ہاتھوں میں رہنے دی۔ جو لوگ اس جنگ میں غیر جانب دار تھے اسے برہمن نے ویش کا نام دیا، لیکن جن لوگوں نے صدیوں تک آریوں یعنی برہمنوں کے دانت کھٹے کیے ان میں سے کچھ میدان جنگ ہی میں قتل کر دیے گیے اور باقی کو شودر (غلام) بنالیا گیا۔ ان شودروں میں بھی دو درجات ہوئے، جو لوگ کچھ عرصہ جنگ کرنے کے بعد غیر جانب دار رہے ان کو سچھوت (چھونے کے لائق) شودر قرار دے کر امن کے ساتھ رہنے دیا۔ جن لوگوں نے جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آخر تک لڑتے رہے ان کو اچھوت شودر قرار دے کر بری طرح کچلا اور ان کی عزت، دولت اور عصمت کو پامال کیا گیا۔ خورد و نوش کے لیے انھیں غلاظت اور مردار گوشت پر اکتفا کرنا پڑا۔ مگر ان میں بھی بعض وہ لوگ تھے جنھوں نے جنگ ہارنے کے باوجود غلامی کو برداشت نہ کیا اور برہمن کی ماتحتی قبول نہ کی، چناں چہ وہ لوگ سکون کی زندگی بسر کرنے کے لیے ہجرت مکانی پر مجبور ہوئے اور جنگل کی راہ لی۔ ناگا، بھیل، سنتھال وغیرہ قبائل اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔[۳۳] غالباً علامہ ابو الریحان البیرونی نے انھی مفتوح اور مظلوم لوگوں کے سلسلے میں یہ لکھا ہے: "سب سے نیچے وہ لوگ ہیں جو کسی ذات میں نہیں آتے اور پیشہ کی طرف منسوب ہیں، یہ Antyaja کہلاتے ہیں وہ یہ ہیں: چمار، نٹ، ٹوکریاں اور ڈھال بنانے والے، ملاح، مچھیرا، چڑی مار، کپڑا بننے والا، ہاڈی، ڈوم، چنڈال اور بدھتو۔ یہ لوگ کسی فرقہ میں داخل نہیں۔"[۳۴]

۳۲۔ ضیاء الدین احمد، **ہندوستانی سماج: ساخت اور تبدیلی** (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء)، ۹۰-۹۱۔

۳۳۔ دیکھیے: مسعود عالم فلاحی، "ہندوستان میں چھوت چھات" **ماہنامہ زندگی نو** (دہلی، مارچ ۲۰۰۳ء)۔

۳۴۔ محسن عثمانی، **ہندو مذہب: مطالعہ اور جائزہ** (دہلی: یونی ورسل پیس فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱ء)، ۱۱۹۔

یہ سماجی تفریق نہ صرف یہ کہ قدیم زمانے میں رائج تھی، بلکہ بعد میں بھی اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ ابن خرداذبہ نے اپنی کتاب المسالک والممالک میں یہاں کی مختلف ذاتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ تو خود یہاں نہیں آیا مگر چوں کہ وہ خلیفہ عباسی کے عہد میں محکمہ خفیہ اطلاعات کا افسر تھا، اس لیے اسے متعدد معتمد ذرائع سے یہاں کے حالات کی خبر ملتی رہی، چناں چہ اس نے سندھ کے تحت یہاں کے شہروں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے حالات اور ذاتوں پر بھی عمدہ تفصیل بیان کی ہے۔ خرداذبہ کے مطابق نویں صدی عیسوی میں یہاں سات ذاتیں موجود تھیں جو تفریق وامتیاز کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھیں۔[۳۵] اس کے بعد بھی ہندوستانی سماج اس شکنجے سے نہ نکل سکا۔ کہیں کہیں آج بھی ان غلط اصولوں پر لوگ عمل کرتے ہیں۔

برہمن دیوتا ہے

ہندوؤں کی کتاب مقدس اور ہندو قانون کے مطابق برہمن انسانی شکل میں سب سے بڑا دیوتا ہے۔ وہ اتنی زیادہ روحانی طاقت کا مالک ہوتا تھا کہ آن واحد میں بادشاہوں اور اس کی فوجوں کو تباہ وبرباد کر سکتا تھا اور جس کو چاہے آباد کر دے اور جسے چاہے برباد۔ اس طرح کا تصور عام تھا۔ یعنی ہر اعتبار سے وہ اولیت واعزاز کا مستحق تھا۔ مگر بدھی صحائف میں دو قسم کے برہمنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک تو پڑھے لکھے برہمن ہوتے تھے جو مذہبی رسوم ادا کرتے اور بڑی عزت حاصل کرتے تھے، لیکن گاؤں کے برہمن بھی ہوا کرتے تھے جو قسمت کا حال بتا کر اور جادوگری کے ذریعہ روزی کماتے تھے۔[۳۶] برہمن کے جو اہم فرائض وید اور قانونی کتب میں درج ہیں، اس کا ذکر ستیارتھ پرکاش میں اس طرح کیا گیا ہے: ”پڑھنا، پڑھانا، یگیہ (رسوم شرعی) کرنا، یگیہ کرانا، خیرات دینا لینا۔“[۳۷]

ان فرائض کے علاوہ برہمنوں نے اور بھی چیزوں کو اپنے لیے خاص کر لیا اور ہر قید وبند اور سماجی ذمے داریوں سے خود کو آزاد کر لیا، بلکہ اس بات پر زور دیا گیا کہ جو کام بھی برہمن انجام دے چاہے اچھا ہو یا برا، اس کے لیے درست ہے اور اس سلسلے میں کوئی اس سے سوال وجواب نہ کرے۔[۳۸]

۳۵۔ سلیمان ندوی، **عرب وہند کے تعلقات**، ۲۵۔

۳۶۔ اے۔ ایل باشم، **ہندوستان کا شاندار ماضی**، ترجمہ: غلام سمنانی (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۲ء)، ۱۹۳۔ ۱۹۴۔

۳۷۔ دیانند سرسوتی، **ستیارتھ پرکاش** (مطبوعہ نئی دہلی، س۔ن)، ۸۸۔

۳۸۔ سید سخی نقوی، **ہمارا قدیم سماج**، ۱۵۲۔

حالاں کہ مذہبی کتابوں میں جو احکام و فرائض برہمن کے لیے خاص کیے گئے ہیں، ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر عمل کر کے انسان دین و دنیا کی کام یابی کے بلند مراحل طے کر سکتا ہے، جو انسانیت کا معیار ہے۔[۳۹] مگر برہمنوں نے اپنی مذہبی کتابوں کی اصل تعلیم کو خلط ملط کر دیا اور لذائذ دنیا کو اس میں داخل کر کے اسے مذہبی رنگ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا، مثلاً ایک جگہ منو مقنن کہتے ہیں: ”جس برہمن کو رگ وید یاد ہے وہ بالکل گناہ سے پاک ہے، اگرچہ وہ تینوں عالم کو ناش کیوں نہ کر دے، یا کسی کا کھانا ہی کیوں نہ کھائے۔“[۴۰] یہ بھی منو کے قانون کا ایک جز ہے: ”زنا بالجبر کی سزا قطع عضو تناسل ہے، لیکن برہمن کو یہ سزا نہ دینی چاہیے، اس لیے کہ اس کو سزائے جسمانی دینے کی ممانعت ہے۔“[۴۱] ”برہمن، چھتری، ویش تینوں میں سے کوئی اگر برہمن کو مار ڈالنے کی نیت سے ہتھیار اٹھائے اور مارے نہیں تو بھی سو برس تک نرک یعنی دوزخ میں رہے گا۔ اگر غصہ کر کے قصداً ایک تنکے سے بھی برہمن کو مارے تو اکیس جنم تک پاپی یعنی کتا گدھا وغیرہ کے جسم میں پیدا ہوگا۔“[۴۲]

چھتری (کشتری)

چھتری کی پیدائش چوں کہ برہما کے بازو سے ہوئی اور بازو یا ہاتھ انسانی عضو کا ایک اہم حصہ ہے جس سے بہت سے اہم امور انجام پاتے ہیں، لہٰذا اس کے فرائض میں داخل ہے کہ جنگوں میں ہتھیار چلائے، ملک اور رعایا کی نگہبانی کرے، زمام سلطنت کی باگ ڈور سنبھالے اور اپنے حسن لیاقت سے ملک اور علاقے کو دشمن کے حملے سے محفوظ رکھے، منو فرماتے ہیں:

(۱) انصاف سے رعایا کی حفاظت اور پرورش کرنا۔

(۲) علم اور دین کی ترویج اور مستحقوں کی خدمت اور امداد میں مال و اسباب خرچ کرنا۔

(۳) اگنی ہوتر وغیرہ یگیہ (فرائض شرعی) ادا کرنا اور رعایا سے ادا کرانا۔

(۴) وید وغیرہ کتب حقہ کا مطالعہ اور ان کے درس و تدریس کا انتظام کرنا۔

۳۹۔ دیانند سرسوتی، مصدر سابق، ۸۷۔

۴۰۔ منو سمرتی۔

۴۱۔ منو سمرتی باب: ۸، اشلوک ۳۶۴، بحوالہ اکبر شاہ نجیب آبادی، نظام سلطنت (بجنور: مدینہ پریس، ۱۹۳۵ء)، ۱۲۴۔

۴۲۔ نفس مصدر، باب: ۴، اشلوک ۱۶۸، ۱۶۹، بحوالہ مرجع سابق، ۱۲۳۔

(۵) محسوسات میں نہ پھنس کر نفس پر قادر رہنا اور اس طرح جسمانی اور روحانی قویٰ کو ترقی دینا۔"[۴۳]

گویا کہ چھتری اور برہمن ایک دوسرے کے جزو لاینفک تھے۔ منو کہتے ہیں: "چھتری برہمنوں کے بغیر مطلق پنپ نہیں سکتے اور نہ برہمن بغیر چھتریوں کے، یہ دونوں مل کر دنیا و عقبیٰ دونوں میں پنپتے ہیں۔"[۴۴]

ویش

ویش بھی سماج میں بلند مقام نہیں رکھتے تھے۔ وہ اس بات پر مامور تھے کہ برہمن اور کھتری کی خدمت بجالائیں۔ چناں چہ دونوں کی خدمت کے لیے جو امور ہوسکتے ہیں وہ ان کے فرائض میں داخل کر دیے مثلاً: "گائے وغیرہ حیوانات کی پرورش، علم اور دین کی ترقی میں مال وزر وغیرہ خرچ کرنا، اگنی ہوتر وغیرہ یگیوں (رسوم شرعی) کا ادا کرنا، وید وغیرہ کتب حقہ کا مطالعہ کرنا، ہر قسم کی تجارت کرنا، چار آنے، چھے آنے، بارہ آنے، ایک روپیہ، سوا روپیہ، سیکڑہ سے زیادہ سود اور اصل سے دوچند یعنی ایک روپیہ دیا ہو تو سو برس میں بھی دو روپے سے زیادہ نہ لینا اور نہ دینا۔"[۴۵]

شودر

چاروں ذاتوں میں شودر ایک ایسی ذات قرار پائی جس کے حصے میں سوائے مذمت اور خفت کے کچھ نہیں آیا، بلکہ قانون کی رو سے وہ انسان میں داخل ہی نہیں ہے۔ شودر کے لیے مقدس آگ کی قربت، قربانی کی رسموں میں شرکت اور ویدوں کی تلاوت ممنوع قرار دے دی گئی۔ وہ اپنے مردوں کو بھی نہیں جلاسکتے۔ اعلیٰ ذاتوں کے ساتھ خور و نوش اور قیام و قعود سب ممنوع قرار پایا۔ وہ بے چارے شہر سے باہر رہتے۔ اگر شودر کا جسم اعلیٰ ذات سے مس ہو جاتا تو وہ ناپاک ہو جاتا، یہاں تک کہ جب کوئی شودر کہیں آئے جائے تو قانون مقدس نے اس کے لیے یہ بات لازم ٹھہرائی ہے کہ وہ ایک مخصوص آواز لگائے تاکہ دوسری ذات والے کو معلوم ہو جائے کہ شودر آرہا ہے یا جارہا ہے تاکہ وہ اس سے دور ہو جائے اور اس کا سایہ تک نہ پڑے؛ منو تو یہاں تک کہتا ہے: "چنڈال یا شودر جس عضو سے بڑے آدمی کو مارے اس عضو کو کاٹ ڈالنا چاہیے۔ ہاتھ سے مارے تو ہاتھ کاٹ ڈالے۔ پاؤں سے مارے تو پاؤں کاٹ ڈالے۔ چھوٹا آدمی بڑے آدمی کے ساتھ آسن میں بیٹھے تو اس کا چوتڑ کاٹ ڈالنا چاہیے اس طرح کہ وہ

۴۳۔ دیانند سرسوتی، مصدرِ سابق، ۹۰؛ گستاولی بان، *تمدن ہند*، ۲۱۶۔

۴۴۔ دیانند سرسوتی، مصدرِ سابق، ۹۰۔

۴۵۔ دیانند سرسوتی، مصدرِ سابق، ۹۰؛ گستاولی بان، مصدرِ سابق، ۲۳۴-۲۳۲۔

مرے نہیں۔"(۴۶) "جو شودر باآواز بلند کسی برہمن کا نام لے کر کہے کہ تو فلانے برہمن سے نیچ ہے تو اس شودر کے منہ میں بارہ انگل کی میخ آہنی آگ میں سرخ کر کے جلتی ہوئی ڈالنی چاہیے۔"(۴۷) "اگر شودر کسی برہمن یا چھتری یا ویش کے ساتھ سخت کلامی کرے تو اس کی زبان میں سوراخ کر دینا چاہیے کیوں کہ وہ جن لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے انھیں کی توہین کرتا ہے۔"(۴۸)

مہابھارت میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ مستقل حق ملکیت کسی شودر کو حاصل نہیں، کیوں کہ اس کی جائداد اس کا آقا اس سے کبھی بھی اپنی مرضی سے لے سکتا ہے۔ اگر کوئی شودر وید مقدس کو سننے کی کوشش کرے تو پگھلا ہوا سیسہ اس کے کان میں ڈال دینا چاہیے۔ اگر وہ وید پڑھے تو اس کی زبان کاٹی جانی چاہیے اور اسے یاد کرے تو اسے مار دیا جانا چاہیے۔ اگر وہ کسی دوسری ذات والے سے کسی طرح بولنے، بیٹھنے اور چلنے میں برابری کا برتاؤ کرے تو اسے جسمانی سزا دی جانی چاہیے۔ اگر کسی اونچ ذات کی عورت سے زنا کرے تو اسے جسمانی سزا دی جائے ورنہ بوری میں باندھ کر جلا دیا جائے۔ اگر وہ کسی اونچ ذات والے سے بدتمیزی کرے تو اس کے اعضا کو کاٹ دیا جانا چاہیے۔(۴۹)

مرکب ذاتیں

ان چاروں ذاتوں کے علاوہ اور بھی دوسری کئی ذاتیں وجود میں آئیں۔ یہ مرکب ذاتیں آپس میں شادیوں کے نتیجے میں وجود میں آئیں اور یہ چاروں ذاتیں نئی نئی جماعتوں اور نئے نئے گروہوں میں تقسیم ہو گئیں۔ مثلاً اگر کسی ویش عورت کی شادی کسی شودر مرد سے ہوتی تو ان سے پیدا ہونے والی اولاد 'آیوگو' کہلاتی تھی، اور اس کا کام ناچنا، گانا اور کشتی کے عوامی مظاہروں میں حصہ لینا تھا۔ اگر کوئی شودر چھتری عورت سے شادی کرتا تو ان کی اولاد کو 'ماگدھ' کہتے تھے اور اس کا پیشہ یہ تھا کہ بازار میں فروخت ہونے والی اشیا کی آواز لگائے۔ ماگدھ جنوبی بہار کے رہنے والے کو بھی کہتے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح 'ماگدھ' ایک خاص علاقے کے رہنے والے کو بھی کہنے لگے اور اس علاقے کے رہنے والوں کی ایک علاحدہ ذات وجود میں آگئی۔ ان مرکب ذاتوں میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، چھتریوں، ویشوں اور شودروں کی ہم جنسی و یک رنگی یکسر ختم ہوگئی یہاں تک کہ برہمن بھی آگے چل کر

۴۶۔ منوسمرتی باب:۸، اشلوک ۴۱۳، بحوالہ نجیب آبادی، مرجع سابق، ۱۲۷۔

۴۷۔ منوسمرتی باب:۸، اشلوک ۲۷۲، بحوالہ مرجع سابق، ۲۲۶۔

۴۸۔ منوسمرتی باب:۸، اشلوک ۲۷۰، بحوالہ مرجع سابق، ۲۲۶۔

۴۹۔ ضیاء الدین احمد، ہندوستانی سماج: ساخت اور تبدیلی، ۱۲۵؛ تفصیل کے ملاحظہ ہو: گستاولی بان، مصدر سابق، ۲۱۸۔

مختلف نئی برادریوں میں تقسیم ہوگئے اور اس کی تقلید دوسری ذاتوں نے بھی شروع کردی جو آج تک جاری ہے۔(۵۰)

ذات پات کے مضر اثرات

ذاتوں کی قانونی تقسیم کے مضر اثرات پورے ملک اور قوم کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔ اسی وجہ سے تمام ترقی مسدود ہو کر رہ گئی۔ ہندوستان کے لوگ چھوت چھات کے باعث بحری سفر کو معیوب سمجھتے تھے۔ اس تفریق سے قومیت کے تصور کا نشوونما نہ ہو سکا اور اس کی وجہ سے تمام ملک کے اتحاد و اتفاق کی ناقدری کی گئی محض اس لیے کہ ذاتوں کی تفریق میں ان کا درجہ پست تھا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ تمام فنون لطیفہ زوال پذیر ہوگئے اور تعلیم و تعلم مخصوص حلقے میں محصور ہو کر رہ گیا اور برہمن سے آگے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ چھتریوں تک محدود رہا۔ اس طرح آبادی کا ایک بڑا حصہ علم و حکمت کی دولت سے محروم ہوگیا۔ ذات پات کی تفریق کے باعث اہل ہند نے باہر کے لوگوں کو "ملیچھ" سمجھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان غیر ملکی علوم و فنون سے بھی محروم رہا۔ پرآشوب اور زوال پذیر معاشرہ کے اسباب، وجوہات اور اس کے اثرات کو نشانہ تنقید بناتے ہوئے پروفیسر مجمدار نے لکھا ہے:

> ذات پات کی تاریکی ہندوستان کے شفاف چہرے پر پھیلتی چلی گئی اور ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ اس تاریکی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شروع میں سیاہ بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا آریوں کی تابناک تہذیب و تمدن پر سایہ ڈال رہا تھا۔ اس وقت یہ ٹکڑا انسان کے ہاتھ سے زیادہ بڑا نہ تھا، لیکن بہت جلد اس نے خوفناک حدود اختیار کرلیں اور تمام فضا پر محیط ہوگیا اور مقررہ وقت سے پہلے گھپ اندھیرے میں تبدیل ہوگیا۔(۵۱)

عورتوں سے متعلق مختلف نظریات و برتاؤ

ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ویدک عہد میں عورتوں کو عزت دی گئی اور انھیں مردوں کی طرح بہت سے حقوق و مراعات ملے۔ اختلافی مسائل میں بھی انھیں اپنی رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ وہ تعلیم و تعلم کے فرائض بھی انجام دیتیں اور مقدس کتابوں کی تلاوت بھی کرتی تھیں، یہاں تک کہ اس نے اپنے حسن لیاقت سے شہرت بھی حاصل کرلی اور تاریخ میں جگہ بنالی۔ ان میں گائتری، میتریی وغیرہ کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مجموعی

۵۰- سید سخی نقوی، ہمارا قدیم سماج، ۱۵۴- ۱۵۵۔

۵۱- R.C. Majumdar *Ancient India* بحوالہ ہمارا قدیم سماج، ۱۶۱۔

طور پر ویدک عہد میں عورتوں کی حالت اطمینان بخش تھی۔(۵۲) مگر برہمنی زمانے سے اس کا زوال شروع ہوا جو بتدریج گھٹتا چلا گیا۔ جیسا کہ راما شنکر ترپاٹھی لکھتے ہیں:

> عورتوں کا درجہ بھی سماج میں ہر حیثیت سے اونچا نہیں تھا، گارگی، واچک لولی اور پتری کی مثالیں بے شک ثابت کرتی ہیں کہ عورتوں کو تعلیم دی جاتی تھی اور ان میں سے بعض علم و دانش کی بلند ترین منزلوں تک پہنچ گئی تھیں، لیکن نہ عورت باپ کی جائداد کی وارث ہو سکتی تھی نہ اپنی کسی ذاتی جائداد کی مالک بن سکتی تھی۔ اگر وہ تھوڑا بہت کچھ کماتی تو وہ باپ یا شوہر کے حق میں واگزاشت ہو جاتا تھا۔ لڑکی کی ولادت بدنصیبی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ راجے اور امرا کئی شادیاں کرتے تھے جو یقیناً کنبے کے لیے کافی تکلیف دہ ہوتی ہوں گی۔(۵۳)

دیگر مذہبی کتابوں میں بھی بعض مقام پر عورتوں کی تحسین کی گئی ہے، مگر عام طور سے مذمت کے ہی اصول پر لوگوں کی آمادگی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک مقام پر منو کہتے ہیں کہ جہاں عورتوں کی پرستش (عزت) کی جاتی ہے وہاں دیوتاؤں کی برکتیں نازل ہوتی ہیں، لیکن جہاں ان کی عزت نہیں کی جاتی وہاں تمام کام بے نتیجہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔(۵۴) ایک دوسری جگہ منو کہتے ہیں کہ عورتیں مردوں کو گم راہ کرنے کا ذریعہ ہیں۔(۵۵) ان کا یہ بھی خیال ہے کہ عورت کبھی آزاد اور خود مختار زندگی نہیں گزار سکتی۔ اسے تو زندگی بھر کسی نہ کسی کی نگرانی اور سرپرستی میں رہنا چاہیے۔ بچپن میں باپ کی، جوانی میں شوہر کی اور بڑھاپے میں بیٹوں کی۔(۵۶) اس کے علاوہ منو کے قانون کے مطابق عورتیں چوں کہ تلون مزاج ہوتی ہیں اس لیے انھیں گواہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جاسکتا۔(۵۷) وہ بارہ سال یا آٹھ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی کو جائز قرار دیتے ہیں،(۵۸) لیکن بیٹی کے فروخت کرنے کے بارے میں انھوں نے متضاد آرا کا اظہار کیا ہے۔(۵۹) اگر عورت بانجھ ہوتی یا صرف لڑکیاں پیدا کرتی یا شوہر کے ساتھ بے وفائی کا برتاؤ کرتی تو شوہر اسے طلاق دے سکتا تھا۔ منو عقد بیوگان اور نیوگ (صلہ رحمی کی شادی) کے خلاف

۵۲- گستاؤلی بان، تمدن ہند، ۱۰۹۔

۵۳- ترپاٹھی، قدیم ہندوستان کی تاریخ، ۷۶۔

۵۴- منوسمرتی، باب: ۳، اشلوک ۵۶، بحوالہ قدیم ہندوستان کی تاریخ، ۱۰۲۔

۵۵- نفس مصدر، باب: ۳، اشلوک ۲۱۳، بحوالہ نفس مرجع۔

۵۶- نفس مصدر، باب: ۹، اشلوک ۳، بحوالہ نفس مرجع۔

۵۷- نفس مصدر، باب: ۸، اشلوک: ۷۷، بحوالہ نفس مرجع۔

۵۸- نفس مصدر، باب: ۹، اشلوک، ۹۴، بحوالہ نفس مرجع۔

۵۹- نفس مصدر، باب: ۸، اشلوک ۲۰۴، باب ۳: اشلوک ۵۱، باب: ۹، اشلوک ۹۸

ہیں۔[۶۰] اس کے بر خلاف نارد دونوں کی اجازت دیتے ہیں۔ استری دھن سے قطع نظر منو نے صاف صاف نہیں بتایا کہ بیوہ اپنے شوہر کے مال میں سے حصہ پانے کی مستحق ہے یا نہیں۔[۶۱] نارد نے عورت کو یہ حق نہیں دیا ہے، جب کہ یاجناوالکیہ شوہر کی جائداد میں وارث کی حیثیت سے بیوہ کے حق کو تسلیم کرتے ہیں: حالاں کہ ستی کی رسم کا جواز کافی عرصے تک تسلیم نہیں کیا گیا، لیکن عورتوں کو چوں کہ مقدس رسموں میں شرکت کی اجازت نہیں تھی اس لیے عورتوں کی زندگی واقعی خوش گوار نہیں رہی ہوگی۔ پردہ کا کوئی ذکر سمرتیوں میں نہیں ہے اور منو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ زبردستی کی حفاظت کرے۔[۶۲] مہابھارت میں عورتوں کے لیے کہا گیا ہے:

عورت جھوٹ کا مجسمہ ہے، اس سے بڑھ کر اور کوئی بدکار ہو ہی نہیں سکتا، وہ چاقو کی دھار کے جیسی ہے۔ زہر، سورج اور آگ کا مجموعہ ہے۔ ہزاروں میں کوئی ایک عورت پاک دامن ہو سکتی ہے؛ زیادہ تر بدکار ہیں؛ در حقیقت وہ قابو سے باہر ہے؛ وہ شوہروں کی عزت اس لیے کرتی ہے کہ انھیں کوئی چاہنے والا نہیں ہے۔[۶۳]

ایک طرف عورتوں کی حق تلفی اور اس کی تحقیر کی ممانعت کا حکم ہے تو دوسری طرف اس کے برعکس معاملہ ہے، مگر مذہبی کتاب میں ایسے اشلوک اور منتر بھی پڑھنے کو ملتے ہیں کہ جن میں مردوں کے شہوانی جذبات کو برانگیختہ کیا گیا ہے اور ان کی تسکین کے لیے عورتوں کو ہی آلہ بنایا گیا ہے۔ اگر عورت ایک نظریہ کے مطابق لائق تحسین ہے تو اس کے ساتھ سماج میں ہمدردی و تکریم کا معاملہ کیا جانا چاہیے اور اگر وہ واقعی بری ہے تو اس سے ہر اعتبار سے اجتناب ضروری ہے۔ یجروید تو اس کی تعلیم دیتا ہے کہ عورتوں سے شہوانی لذت حاصل کرنے میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ اس سے دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ چند اشلوک قابل ملاحظہ ہیں:

"اے استریو! تم عمدہ پھولوں اور خوش ذائقہ پھلوں والی اوشدھی کا سیون کرو تاکہ عین رتوکال میں تمھیں گربھ (حمل) پراپت ہو اور تمہارا گربھاشیہ اپنی اصلی جگہ قائم رہے۔"[۶۴]

۶۰۔ نفس مصدر، باب: ۹، اشلوک ۶۵، بحوالہ نفس مرجع۔

۶۱۔ نفس مصدر، باب: ۹، اشلوک ۲۱۷، بحوالہ نفس مرجع۔

۶۲۔ نفس مصدر، باب: ۹، اشلوک ۱۰، بحوالہ نفس مرجع، ۱۰۳۔

۶۳۔ مہابھارت۔

۶۴۔ **یجروید**، باب: ۱۱، اشلوک ۴۸، بحوالہ نجیب آبادی، **وید اور اس کی قدامت**، ۴۷۔

"اگر کسی عورت کے پاس دس خاوند ہیں، مگر اس کے بعد برہمن اس کا ہاتھ پکڑے تو وہ برہمن کی ہو جاتی ہے۔ برہمن ہی خاوند ہے، نہ چھتری، نہ ویش، تمام لوگوں میں اس امر کا اعلان کرتا ہوا سورج ہر روز چلتا ہے۔"(۶۵)

بعض مورخوں کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش کرتے تھے۔ جین مذہب کے ماننے والے بھی ننگے مرد کی تکریم و تعظیم عبادت کے طور پر کرتے ہیں۔ جس کا مظاہرہ سال کے کسی مخصوص دن میں علی الصباح شاہ راہ عام پر بایں طور کرتے ہیں کہ ایک مرد (مذہبی پیشوا) آگے آگے چلتا ہے اور ان کے معتقدوں کی بھیڑ (جن میں بوڑھے جوان، بچے، عورت اور مرد سب ہوتے ہیں) احتراماً پیچھے پیچھے چلتی ہے۔

جب اس قسم کا نظریہ کسی مذہب اور سماج میں پایا جاتا ہو تو وہاں عصمت و عفت کی بحالی ناممکن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب برہمنوں نے شودروں پر فتح حاصل کی تو انھوں نے شودر عورتوں کی پچاس پچاس کنواری لڑکیاں ایک ایک برہمن کو عطا کیں۔(۶۶) ایک دوسری روایت کے مطابق راجہ نے تخت نشینی کرانے والے پروہتوں کو دس ہزار داسیاں اور دس ہزار ہاتھی دیے۔(۶۷)

تضاد کا پہلو دیکھیے کہ شودر اور چنڈال کا سایہ تک برہمن کو ناپاک کر دیتا ہے اور اس کے رہنے کے لیے گاؤں سے باہر جگہ تجویز کی جاتی ہے۔ مگر شودر عورتوں سے جنسی تسکین میں کوئی عیب کی بات نہیں۔ آج بھی اونچی ذات کے لوگ کم تر ذات کی عورتوں کا استحصال کرتے ہیں اور اگر اسے قانون کا خوف نہ ہو تو عورتوں کا بڑے پیمانے پر استحصال کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کریں گے۔ مجموعی طور پر عورت ہر زمانے میں ذلیل و خوار رہی ہے۔ دیانند نگری لکھتے ہیں:

منو سے لے کر جیوتی سر (۱۴ویں صدی عیسوی) تک عورت کے اخلاق کے سلسلے میں مسلسل اتار چڑھاؤ ہوتا رہا ہے۔ ایک طرف "جہاں عورت کی پوجا ہوتی ہے وہاں دیوتا قیام کرتے ہیں" کی تمثیل دے کر سماج میں عورت کے مقام و احترام کی دہائی دیتے ہیں، وہیں دوسری طرف "عورت کا اخلاق بڑا شدید تکلیف پہنچانے والا ہوتا ہے۔" کہنے میں وہ ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔ عورت کو بھلے ہی کبھی کبھی دیوی کے روپ میں پیش کیا گیا ہو، بھلے ہی گارگی، متریی یا سلبھا جیسی علمی شخصیات پیدا ہوئی ہوں، لیکن قدیم دھرم گرنتھوں کے مطالعہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عموماً عورت شودر، کتے اور گنوار کو "جھوٹ" کہہ کر ایک ہی درجہ میں رکھا جاتا تھا اور پیدائش سے لے کر موت تک اسے سماج میں مذمت،

۶۵۔ **یجروید**، باب: ۱۵، اشلوک: ۱، بحوالہ ترپاٹھی، **قدیم ہندوستان کی تاریخ**۔

۶۶۔ محسن عثمانی، "شذرات" سہ ماہی السلام، دہلی (جولائی۔ ستمبر، ۱۹۹۸ء)۔

۶۷۔ نفس مرجع۔

تحقیر اور بے حرمتی کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا، جہاں لڑکے کی پیدائش خاندان کے لیے بے حد مسرت کا سبب تھی وہیں لڑکی کی پیدائش انتہائی غمی کا۔

ابتدائی دور سے لے کر اب تک ایک سے ایک، دھرم پرچارکوں کا اس دیش میں آنا ہوا مگر عورت اور شودر دونوں ان کی نظر میں قابل مذمت ہی رہے اور تو اور ویدوں کی اہمیت کو چیلنج کرنے والے، ہندو سماج میں پائی جانے والی برائیوں کی مذمت کرنے والے، مادی تکالیف کو دور کرنے کا راستہ ڈھونڈھنے والے اور سب کے لیے نجات (مکتی) یا نروان کا راستہ دکھانے والے مہاتما بدھ کے دل میں بھی عورت کے لیے لامتناہی نفرت ہی تھی۔ ان کی نظر میں "عورت قاتل کی چھری" یا "شیر کے منھ" سے زیادہ زخم پہنچانے والی تھی۔ جاتک کتھا میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ سمندر، بادشاہ، برہمن اور عورت لمبی مدت سے بھوکے رہے ہیں۔ ان کی خواہشات کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا۔ اس طرح پوری صنف نازک کے لیے قدیم زمانے سے ہمارے سماج میں جو نفرت اور تحقیر کا جذبہ موجود رہا ہے، وہ تہذیب کا ایسا کلنک ہے جس کے سامنے شرم کو بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ (۶۸)

مذہبی عبادت گاہوں کو عورتوں کے لیے کھولا تو ضرور گیا، مگر ان میں بھی عورتوں کا استحصال کیا جاتا رہا۔ عہد وسطی کے ہندوستان کی تاریخ میں اس طرح کے بہت سے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں کہ بیشتر ہندو عبادت گاہوں میں عورتیں نہ صرف عبادت کے لیے پہنچتی تھیں، بلکہ بہت سی عورتیں جنسی تسکین کے لیے موجود ہوتی تھیں؛ سید امیر علی لکھتے ہیں:

چوں کہ دیوتا ناچ گانے کے رسیا ہوتے تھے، اس لیے مندروں میں بہت سی ناچنے گانے والی عورتیں ہوتی تھیں جو نام کو تو دیوداسیاں کہلاتی تھیں، لیکن در اصل پروہتوں کے آنند کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ عورتوں کو شروع شروع کے قوانین میں بہت پست درجہ دیا گیا تھا۔ منو نے عورتوں کے بارے میں جو نفرت و ملامت سے بھرے ہوئے الفاظ لکھے ہیں، ان کی نظیر صرف عیسوی سینٹ ٹرٹیلن (Tertullian) کے تعصب آمیز اقوال میں ملتی ہے۔ منو کہتا ہے کہ عورتوں میں ناپاک خواہش ہوتی ہیں، وہ ارادے کی کچی اور چال چلن کی خراب ہوتی ہیں، ضروری ہے کہ انھیں دن رات کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔ (۶۹)

اولاد کے حصول کے طریقے اور نیوگ

کسی بھی سماج، قبیلے اور گھر کے اندر بچے کی پیدائش کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے افزائش نسل کا اور سماج میں اس بچے کا بڑا مقام ہے جس کی تخم ریزی اور پیدائش جائز طریقے سے ہوتی ہے۔

۶۸- محسن عثمانی، ہندو مذہب: مطالعہ اور جائزہ، ۲۶۶-۲۶۵۔

۶۹- امیر علی، روح اسلام، ۱۹۔

البتہ ہندوؤں کے یہاں قدیم زمانے میں اولاد کے حصول کے لیے ایسے طریقے بھی اپنائے جاتے تھے جو حرام کاری پر مبنی تھے۔ بعض شوہر اپنی مرضی سے بیوی کو دوسرے مرد یا بھائی کے پاس بھیج دیتے تھے اور یہ کوئی عیب کی بات نہ تھی۔ خاص کر اس موقع پر کہ جب ان میں مرد یا عورت بچہ کی تخم ریزی اور آب یاری کی صلاحیت نہ رکھتے ہو اور ضرورت بچے کی ہو تا کہ خاندانی سلسلہ آگے بڑھتا رہے۔ رزمیہ داستانوں میں اس قسم کے شواہد ملتے ہیں، جس کے مختلف طریقے تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ خاوند اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو تو وہ اپنی بیوی کو ہدایت کرے کہ تو اولاد کے حصول کے لیے دوسرے مرد کے ساتھ رات بسر کرلے۔ اسی طرح عورت امراض و مصائب میں مبتلا ہو کر اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو تو اپنے شوہر کو ہدایت کرے کہ تو کسی اور عورت سے نیوگ کے ذریعہ اولاد حاصل کرلے۔ اس بارے میں تاریخی مثالیں بھی موجود ہیں۔ جیسے راجہ پانڈو کی رانی کنتی اور مادری وغیرہ نے بذریعہ نیوگ لڑکے پیدا کیے، اور ویاس جی نے چترانگد اور وچتر ویریہ کے مرجانے کے بعد وچتر ویریہ کی زوجہ امبکا سے دھرت راشٹر، امبالکا سے پانڈو اور باندی سے وڈر پیدا کیا۔

اگر خاوند دین کے کام کے لیے پردیس گیا ہو تو عورت آٹھ برس، اگر علم یا شہرت حاصل کرنے کے لیے گیا ہو تو چھے برس اور اگر دولت وغیرہ کی خواہش سے گیا ہو تو تین برس تک انتظار کرے۔ اس کے بعد نیوگ سے اولاد پیدا کرے اور جب خاوند واپس آجائے تو نیوگ سے تعلق قطع کرلے۔ ان تمام صورتوں میں اولاد اس کے خاوند کی وارث ہوگی۔[۷۰]

نیوگ ایک ایسی سماجی برائی ہے کہ کوئی شریف آدمی اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے بہت سے اہل علم اور ہندو مفکرین نے اس کے خلاف بہ کثرت مضامین لکھے۔ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کو لوگوں نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے کیوں کہ انھوں نے نیوگ کے انسداد پر کافی زور دیا ہے۔[۷۱]

لڑکوں کی فضیلت

رگ وید کی قدیم ترین مناجاتوں سے پتا چلتا ہے کہ لڑکوں کو بہت بابرکت سمجھا جاتا تھا، کم از کم ایک لڑکا تو ضروری تھا، تا کہ وہ اپنے باپ کی موت پر اس سے متعلق رسوم انجام دے سکے اور اس طرح اس دنیا سے دوسری

۷۰- ستیارتھ پرکاش، ۱۲۰-۱۱۸۔

۷۱- ہندومت (مجموعۂ مضامین) (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری)، ۳: ۳۴۸-۳۷۳۔

دنیاتک اس کا سفر یقینی ہو سکے۔ اس کے بر عکس لڑکیاں نہ تو دوسری دنیا میں والدین کی کوئی مدد کر سکتی تھیں اور نہ اس دنیا میں نہ ان سے کوئی خاندانی شاخ ہی چل سکتی تھی، کیوں کہ قدیم روایت کے مطابق شادی ہوتے ہی انھیں اپنے شوہروں کے خاندان کی رکنیت حاصل ہو جاتی تھی۔ شادی کے موقع پر جہیز کے التزام نے ان کی پسندیدگی میں مزید تخفیف کر دی تھی۔ اس طرح لڑکیوں کی ناپسندیدگی کے بڑے عملی اسباب تھے اور یہ امر حیرت ناک ہے کہ ایک ایسی تہذیب میں جو اس درجہ اولاد ذکور کے حق میں ہو، لڑکیوں کو پھینک دینے یا بچپن ہی میں ان کو قتل کر دینے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بعد کے عہد میں راجپوت خاندان اکثر اپنی بچیوں کو ختم کر دیتے تھے اور شاید غریب خاندان کے لوگوں نے بھی یہ رویہ اختیار کیا ہو، لیکن قدیم کتب قوانین میں بچیوں کو پھینکنے یا ان کو بچپن میں قتل کرنے کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ بہترین ہندوستانی خاندانوں میں، اگرچہ لڑکیوں کی ولادت افسوسناک ہوتی تھی، لیکن ان کی پرورش و پرداخت لڑکوں کی طرح لاڈ پیار سے کی جاتی تھی۔[۷۲] براہمنوں کے دور کا مقولہ ہے کہ: ”لڑکی اپنے ساتھ مصیبتیں لاتی ہے، لڑکا ساتویں آسمان کا نور ہے۔“[۷۳] سکندر اعظم کے تاریخ نویس کا بیان ہے کہ اس عہد میں ہندو غریب خاندان کے لوگ اپنی لڑکیوں کو فروخت کر دیتے تھے، مگر یہ رواج پورے ہندو معاشرہ میں عام نہ تھا۔

تعلیم

قدیم زمانے میں غریب خاندان کا بچہ جیسے ہی چلنے لگتا کسی نہ کسی کام میں لگا دیا جاتا تھا۔ اس کے بر عکس دولت مند گھرانے کے بچے پڑھنے لکھنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ دولت مند گھرانوں کے بچوں کے پڑھنے لکھنے کے لیے استاد مقرر کیے جاتے تھے، مگر عہد وسطی میں مندروں سے منسلک گاؤں کے مدرسوں میں بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم کا انتظام شہروں میں کم تھا، جب کہ دیہات ہی میں زیادہ تر تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم نسواں پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا، مگر اس پر پابندی بھی نہیں تھی۔ اچھے خاندان کی عورتیں بالعموم اور برہمن کی عورتیں بالخصوص پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔

۷۲- باشم، **ہندوستان کا شاندار ماضی**، ۲۲۱-۲۲۲۔

۷۳- *Cambridge Hestory of india*, 1:1 بحوالہ مجیب احمد، **تاریخ تمدن ہند** (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۹ء)، ۵۷۔

بچے کی ولادت اور جینیو پہنانے کی رسم ادا کر لینے کے بعد طالب علمی کا زمانہ شروع ہو جاتا اور وہ بچہ کسی گرو کے پاس رہ کر ایسی تعلیم حاصل کرتا جو دین اور دنیا کا حق ادا کرنے اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ گرو عموماً بستیوں کے باہر رہتے تھے اور شاگردی کے دوران ہر طالب علم اس کے خاندان کا رکن، اس کا بیٹا اور خادم تصور کیا جاتا۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر نوجوان شادی کر کے گرہست یعنی گھر بار والا بن جاتا۔ جب اس کے لڑکوں کی شادی ہو جاتی اور پوتے پیدا ہو جاتے تو اس کے لیے دنیا سے کنارہ کش ہونے کا وقت آجاتا اور آخر میں مناسب یہ ہوتا کہ وہ دنیا کو بالکل چھوڑ کر سنیاس اختیار کرے اور جنگلوں میں رہ کر سارا وقت عبادت اور ریاضت میں گزارے۔ اس طرح ہر شخص کی زندگی چار حصوں میں تقسیم ہو جاتی جو چار آشرم کہلاتے تھے۔ ایک دور طالب علمی کا دوسرا گھر بار اور دنیا کی ذمے داریوں کا تیسرا گوشہ نشینی کا اور چوتھا ریاضت اور بن باس کا۔ (۷۴) برہمنوں کے لیے طالب علمی کا دور زیادہ لمبا اور دوسرا زیادہ مختصر ہوتا۔ چھتریوں اور ویشوں کے لیے دوسرا دور نسبتاً لمبا اور باقی تینوں ادوار مختصر ہوتے تھے۔ (۷۵)

شادی اور اس کی رسمیں

ہندو دھرم کے آدرش کے مطابق طالب علمی کی مدت بارہ سال کی ہوتی۔ اس کے بعد بہت سے طالب علم تجرد کا عہد کر لیتے اور تمام زندگی مذہب کے مطالعے میں گزارتے، جب کہ ان میں سے کچھ طالب علم بیس سال کی عمر تک اپنے گھر واپس آجاتے۔ اس کے بعد شادی کی رسم ادا کی جاتی۔ ہندو دھرم کے مطابق شادی کے تین مقاصد ہوتے ہیں:

(۱) خانگی عبادت و ریاضت کے ذریعے مذہب کی ترقی۔

(۲) اولاد جو باپ اور اس کے اسلاف کے لیے ایک با اخلاق زندگی اور بعد الموت کی ضمانت تھی اور خاندان چلتا رہتا تھا۔

(۳) رتی، یعنی جنسی انبساط۔ (۷۶)

۷۴۔ گستاؤلی بان، مصدر سابق، ۲۱۴۔

۷۵۔ محمد مجیب، تاریخ تمدن ہند، ۵۱-۵۷۔

۷۶۔ ہاشم، مرجع سابق، ۲۲۸۔

عموماً یہ شادی شگون کے ذریعے طے پاتی تھی جوڑے عموماً ایک ہی ذات اور طبقے کے ہوتے تھے۔ شادی ایسے دو افراد کے درمیان ممنوع تھی جن کے والدین باپ کی طرف سے سات پشت پہلے یاماں کی طرف سے پانچ پشت پہلے تھے مگر بعض علاقوں اور قبیلوں میں اس قانون پر کم عمل ہوتا تھا۔(۷۷)

اگرچہ قدیم زمانے میں شادی سے پہلے زوجین کا پورے طور پر بالغ ہو جانا ضروری تھا، لیکن سمرتیوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ شوہر کی عمر کم از کم بیس سال ہونی چاہیے اور لڑکی کی شادی بلوغ سے کچھ قبل کر دینی چاہیے۔ جہاں تک بچپن کی شادی کا تعلق ہے جو بعد کے دور میں فارغ البال خاندانوں میں عام ہو گئی تھی، اس کا مذہبی کتب میں کوئی ذکر نہیں اور جو لوگ بچپن کی شادی کو پسند کرتے تھے وہ مخصوص خطرات کے پیش نظر: ٹھیک وہی اندیشہ انھیں لاحق تھا جو آج کل مخلوط معاشرے میں والدین کو ہوتا ہے۔ جس زمانہ میں البیرونی ہندوستان آیا اس عہد میں لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کم سنی میں کر دی جاتی تھی۔(۷۸)

مذہبی شادی میں اہم اور پیچیدہ رسوم ادا کیے جاتے تھے۔ ان کے اخراجات لڑکی والے برداشت کرتے تھے۔ جہیز کے ساتھ یہ سب چیزیں باپ اور خاندان والوں کے لیے بار ہو جاتی تھیں۔ آج بھی ہندو والدین اپنی لڑکی کی شادی کے لیے اپنے آپ کو ہمت شکن قرضہ جات میں پھنسا لیتے ہیں؛ حالاں کہ مختلف کتابوں میں شادی کی رسم کے جو قوانین پیش کیے گیے ہیں وہ اپنی تفصیلات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جہاں تک مراسم شادی کا تعلق ہے وہ آج کے مراسم شادی یارگ وید میں پیش کردہ مراسم شادی سے مختلف نہیں ہیں۔ بعض بیانات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکی بیاہنے کے بدلے میں باپ کو کچھ وصول کرنے کا بھی حق تھا جس کی ایک عامیانہ شکل یہ تھی کہ باپ لڑکی کا اسی طرح سودا کرتا جیسے کسی اور مال کا۔ غالباً شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکیوں کی حیثیت کسی ایک قاعدے یا قانون پر منحصر نہ تھی، بلکہ جیسا اس کا خاندان ہوتا اور جیسے رشتے کے خواہش مندوں کی حالت اور تعداد ہوتی ویسی ہی شادی کی شرطیں ہوتی تھیں۔(۷۹)

تقریب شادی سے متعلق جو رسمیں تھیں ان میں اور موجودہ رسم میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ دولہا کے ساتھ بارات ضرور ہوتی۔ دلہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دیا جاتا۔ دونوں پوجا کی آگ کے گرد طواف کرتے۔ ساتھ بیٹھ کر چڑھاوے کا کھانا کھاتے۔ ازدواجی رشتے میں استقلال پیدا کرنے کے لیے دولہا اپنی دلہن کو پتھر پر کھڑا

۷۷۔ نفس مرجع، ۲۲۹۔

۷۸۔ محسن عثمانی، ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ، ۱۲۶۔

۷۹۔ مجیب، تاریخ تمدن ہند، ۸۔

کرتا۔ شام کے وقت اسے گھر کے باہر جا کر قطب ستارہ دکھایا جاتا۔[۸۰] مذہبی کتابوں میں شادی کی آٹھ قسمیں بیان کی گئی ہیں۔[۸۱] ان میں سے چار قسمیں اعلیٰ خاندان برہمن کے لیے تھیں جبکہ شادی کی دیگر چار قسمیں صرف چھتریوں، دیشوں اور شودروں کے لیے تھیں۔ شادی کا سب سے اہم طریقہ صرف برہمنوں کے لیے مخصوص تھا۔[۸۲] شادی کی ان آٹھ شکلوں کے علاوہ ایک اور شکل کا پتا چلتا ہے جسے سوئمبر کہا جاتا ہے جو دراصل گاندھر وطریقہ کی ایک شکل تھی۔ وہ یہ تھی کہ لڑکی کے والد اپنی لڑکی کو اس جگہ لے جاتے جہاں لوگوں میں کسی طرح کا کوئی اہم مقابلہ ہو رہا ہوتا، جس میں جیتنے والے کو لڑکی پسند کر لیتی اور اسے اپنا شریک حیات مان لیتی۔ دروپدی اور سیتاجی کی شادی اسی طرح انجام پذیر ہوئی تھی۔[۸۳]

تعدد ازدواج

ویدی آریوں میں عام طور سے یک زوجگی کا ہی رواج تھا۔ مگر ایسے بھی شواہد ملتے ہیں کہ بادشاہ، سردار، بہت سے برہمن اور نچلے طبقے کے لوگ بھی بعض اوقات تعدد ازدواج پر عامل تھے۔[۸۴] اگرچہ اس عمل کو مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا اور خاص کر اس وقت جب پہلی بیوی وفاشعار ہو اور بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ چند زوجگی پر عامل شخص پر زور دیا جاتا کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ منصفانہ رویہ اختیار کریں۔

بعض ہندوؤں کا خیال ہے کہ بیویوں کی تعداد ذات اور ورن پر موقوف ہے، مثلاً برہمن کو چار، کھتری کو تین، ویش کو دو اور شودر کو ایک بیوی کرنے کا حق ہے۔ جب کہ مسٹر ودیا کے مطابق ہندوؤں کی قانون کی کتابوں یا روایتوں میں بیوی کی اس تعداد کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ راجے عام طور پر جتنی رانیاں چاہتے تھے اپنے محلوں میں جمع کر لیتے تھے، چناں چہ شری کرشن کی ایک سو آٹھ بیویاں تھیں۔[۸۵]

چند زوجگی کے ساتھ چند شوہری کا بھی رواج پایا جاتا تھا۔ چند شوہری کے سلسلے میں مہابھارت قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں پانڈو ایک مشترکہ بیوی دروپدی پر قانع ہیں۔ ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کی بیوی سے

۸۰۔ نفس مرجع۔

۸۱۔ نقوی، **ہمارا قدیم سماج**، ۱۳۲-۱۳۳؛ باشم، مرجع سابق، ۲۳۲۔

۸۲۔ نقوی، مرجع سابق، ۲۳۔

۸۳۔ نفس مرجع، ص:۱۲۳

۸۴۔ گستاؤلی بان، مصدر سابق، ۱۹۰- ۱۹۱۔

۸۵۔ عبدالمجید سالک، **مسلم ثقافت ہندوستان میں** (لاہور، س ن)، ۲۹۔

لطف اندوز ہوتا تھا۔ نیز شوہر قوت رجولیت سے عاری ہوتا یا اس سے بچے پیدا نہیں ہوسکتے تو اس کے لیے دوسرے طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے تھے۔ اس کے پاس آخری طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی جگہ کسی قریبی عزیز کو عام طور پر اپنے بھائی کو توالد و تناسل کے لیے مقرر کرے۔ رزمیات اور دوسرے ذرائع سے ایسے قصے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص قسم کی پاک بازی رکھنے والے مقدس افراد اس قسم کے مطالبات کی تکمیل کے لیے موجود ہوتے اور کہا جاتا ہے کہ یہ عمل آج بھی ہوتا ہے۔ دکن کے چند نچلے طبقات میں بھی چند شوہری کا رواج ہے۔ مالا بار کے نائروں میں بھی حال تک یہ رسم باقی تھی۔ (۸۶) سلیمان تاجر جب ہندوستان آیا تو اس نے تعدد ازدواج کا رواج عام پایا، چناں چہ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان اور چین میں حرم کا دستور نہیں ہے، لیکن نکاح ان دونوں ملکوں میں مرد جتنی عورتوں سے بھی چاہے کر سکتا ہے۔ (۸۷)

بیوائیں

وہ شادی شدہ عورت جس کا شوہر موت کے آغوش میں چلا گیا ہو، اسے دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ چاہے مرنے والے کی بیوی کی عمر بہت ہی کم کیوں نہ ہو۔ پوری عمر مجرد زندگی گزارنی پڑتی تھی، یہاں تک کہ نیوگ کی رسم بھی اس کے لیے جائز نہ تھی، جب کہ دیانند نگری لکھتے ہیں: ”بیواؤں کی شادی کا چلن ماقبل ویدک زمانے سے لے کر ویدک زمانے کے بعد کے دور تک تھا۔“ (۸۸)

بلکہ یہ کہا جائے کہ ابتدائی زمانے میں اسے عمومیت حاصل تھی، جب کہ کوٹلیہ کے مطابق شوہر کے مر جانے یا بہت عرصے تک غائب رہنے پر اس کی بیوی دوسری شادی کر سکتی ہے، بشرطے کہ سات ماہواری گزار چکی ہو یا ایک سال گزر گیا ہو۔ دھرم سوتروں میں بھی ایسا ہی کہا گیا ہے۔ بیواؤں کی شادی عموماً خاوند کے بھائی کے ساتھ ہوتی تھی۔ مگر منو اس بات پر زور دیتا ہے کہ ایک معزز عورت کے لیے دوسرے شوہر کی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔ (۸۹) یہی وجہ ہے کہ بعد کے عہد میں بیواؤں کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہو گئی اور شوہر کے انتقال کے بعد انھیں منحوس قرار دیا جانے لگا۔ ان کے لیے سخت سے سخت قوانین نافذ کیے گیے۔ ان کے خور و نوش، لباس و قیام اور

۸۶۔ اے ایل باشم، مرجع سابق، ۲۴۰؛ گستاؤلی بان، مصدر سابق، ۱۱۰۔

۸۷۔ مناظر احسن گیلانی، ہزار سال پہلے (دیوبند: ثمرۃ التربیت، ۱۹۵۰ء)، ۴۲۔

۸۸۔ محسن عثمانی، ہندو مذہب: مطالعہ اور جائزہ، ۲۷۳۔

۸۹۔ اے ایل باشم، ہندوستان کا شاندار ماضی، ۲۵۷-۲۵۹۔

آرائش وزیبائش پر بھی پابندی لگادی گئی۔ ان کے لیے مذہبی مراسم کی ادائی اور اس میں شرکت بھی ممنوع ٹھہرادی گئی؛ پروفیسر ضیاء الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

ہندو سماج میں بیواؤں کا درجہ بہت پست تھا، ایک بیوہ اپنے خاندان میں فال بد سمجھی جاتی تھی، گھر میں ایک ذلیل اور منحوس وجود اس کا تھا، صبح سویرے کوئی اس کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا، گویا وہ سماج میں ہر طرح سے ناقابل قبول تھی۔ اگر جوان اور خوب صورت بیوہ سے کوئی جنسی لغزش سرزد ہوجاتی تو مرد ہمیشہ بری الذمہ سمجھا جاتا۔ حمل کی صورت میں اسے پورے خاندان اور پڑوس کی لعنت سنی پڑتی، یہاں تک کہ اسے خودکشی کر کے اپنی جان بھی ختم کرنی پڑتی تھی۔ اس کا یہ گناہ سماج کے لیے ناقابل معافی تھا اور اس کی چار پشتوں تک اس کی اولاد کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔[۹۰]

ستی

ایک بیوی کے لیے جو مستحسن عمل ہندو سماج میں رائج تھا وہ شوہر کی چتا کے ساتھ جل کر خاک ہو جانا تھا اور جسے پاک بازی کی علامت سمجھا جاتا تھا، کیوں کہ ہندوؤں کی مقدس کتاب کی رو سے شوہر چاہے جتنا بھی بد چلن، نالائق اور نااہل ہو، شادی ہو جانے کے بعد بیوی مکلف تھی کہ ہر حال میں اس کی عزت کرے اور بھگوان کا درجہ دے۔ یہ چیز شوہر کی زندگی میں بھی اسے اختیار کرنا ہوتی اور مرنے کے بعد بھی، جس کی شکل ستی کی ہوتی تھی یا پھر ساری زندگی اسے بیوہ رہ کر گزارنا پڑتی تھی۔ مگر اس طرح زندگی گزارنے میں جو مشکلات تھیں وہ کافی اذیت ناک تھیں۔ لہٰذا عورت گھٹ گھٹ کر مرنے کے بجائے شوہر کی چتا کے ساتھ ہی جل جانے کو بہتر اور کار ثواب تصور کرتی تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ رسم کب سے ہندوستانی سماج میں داخل ہوئی۔ اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔ البتہ اس بات کا پتا چلتا ہے کہ بیوہ کو جلانے کی رسم کسی زمانے میں برتی جاتی تھی۔ آریہ جب ہندوستان آئے تو چھتریوں کے سوا باقی تمام ذاتوں نے اسے ترک کر دیا تھا۔ بس اس کی یہ نشانی باقی رہ گئی تھی کہ بیوی کو شوہر کی چتا کے ساتھ کچھ دیر کے لیے لٹا دیا جاتا، پھر لوگ اسے اٹھالیتے تھے۔ اگر کوئی مرد لاولد ہوتا تو اس کی بیوہ کو اٹھاتے وقت کہا جاتا کہ شوہر کے بھائی سے شادی کر کے شوہر کا نام باقی رکھے۔[۹۱] مگر یہ چیز بعد کے عہد میں ختم ہو گئی اور ستی کی رسم پر سختی سے عمل کیا جانے لگا۔ ستی کی پہلی یادگار ہمیں مدھیہ پردیش میں ساگر کے قریب 'اران' کے مقام پر ملتی ہے۔ یہاں ایک ستون پر ۵۱۰ء کا ایک کتبہ ہے جس میں ایک ہیرو اور اس کی بیوی کا المناک واقعہ درج

۹۰۔ ضیاء الدین احمد، مرجع سابق، ۳۱۴۔

۹۱۔ مجیب، تاریخ تمدن ہند، ۵۷۔

ہے۔[۹۲] سکندر اعظم کے مورخ نے لکھا کہ چوتھی صدی ق م میں ہندوستان میں اس کا رواج تھا اور غریب خاندان کے لوگ لڑکیوں کو بیچ دیتے تھے۔[۹۳] سلیمان تاجر نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، مگر اس نے اس رسم کو ہندوستان کے راجاؤں اور مہاراجاؤں تک ہی محدود لکھا ہے۔[۹۴] جب کہ یہ رسم عام ہو گئی تھی، البتہ بعض اوقات عورت کی مرضی کا بھی اس میں دخل ہوتا تھا۔

مسلمان جب ہندوستان میں آئے اس وقت بھی یہ رسم جاری تھی۔ محمد بن قاسم کے عہد میں سندھ کے راجا کی کئی رانیوں اور کنیزوں نے راجا کے مرنے کے بعد ستی ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ان میں کچھ رانیوں نے ایسا کیا بھی۔ مغل حکم رانوں نے بھی اس رسم پر پابندی لگائی مگر وہ اس میں پوری طرح کام یاب نہ ہو سکے، مگر یہ رسم انیسویں صدی میں آکر بہت ہلکی ہو گئی، مورخ ضیاء الدین احمد لکھتے ہیں:

> سولہویں صدی کے بعد سے ستی کو روکنے کی کوشش کی جانے لگی تھی، لیکن پرانی روایت پرستی کے اثر میں بعض علاقوں میں ستی جاری رہی۔ ڈوبوتز اور ملکوم کے مطابق جنوبی ہند میں اور مرہٹوں کی حدود سلطنت میں ستی کا رواج برائے نام تھا۔ سکرافٹن کا کہنا ہے کہ بنگال میں بھی اس کا عام رواج نہیں تھا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا سے یہ رواج پھر زور پکڑنے لگا۔ پروفیسر کپاڈیا بتاتے ہیں کہ ۱۸۱۵ء۔ ۱۸۲۵ء کے دوران بنگال میں ستی کے ۸۱۳۴ واقعات سرکاری طور پر تسلیم کیے گیے اور اس کا ۵/۳ حصہ صرف کلکتہ میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ آٹھ سال سے بھی کم کی تھی، اور ترپین لڑکیاں نو اور سولہ سال کے بیچ کی تھیں۔۔۔۔۔ ایسی بھی خبر ملی ہے کہ انھیں شوہر کے چتا میں رسی کے ذریعے آگ میں لٹکا دیا جاتا تھا اور ڈھول اور باجوں کی گونج میں ان کی چیخ مدھم پڑ جاتی تھی۔ انگریز سرکار نے اس بے رحم سماجی رسم کو غلط سمجھا۔ راجہ رام موہن رائے نے جب ہندوؤں کی سماجی برائیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور خصوصی طور پر رسم ستی کی شادی اور ستی کو ختم کرنے کی تحریک شروع کی تو حکومت نے اسے غنیمت سمجھ کر بعد میں ستی کی ممانعت کا قانون پاس کر دیا۔ اس قانو کے پاس ہونے کے ساتھ ہی ستی کا رواج بالکل ختم تو نہ ہوا، البتہ اس میں کمی آگئی۔[۹۵]

آزادی کے بعد بھی ملک کے بعض حصوں میں اس رسم پر عامل افراد کا ثبوت ملتا ہے اور آج بھی کہیں کہیں اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ ۲۷ر جنوری ۲۰۰۵ء کو بی بی سی لندن نے ستی سے متعلق ایک خبر نشر کی جس میں

۹۲- اے ایل باشم، مرجع سابق، ۲۵۹۔ نیز ملاحظہ کریں:

Ram Sharan Sharma, *Ancient india* ,P.190.N.C.E.R.T. Delhi,1999.

۹۳- نفس مصدر، ۱۱۰۔

۹۴- گیلانی، مرجع سابق، ۹۱۔

۹۵- ضیاء الدین احمد، مرجع سابق، ۳۰۴- ۳۰۵۔

بتایا گیا ہے کہ بیس سال قبل ستی سے متعلق کئی وارادات عدالت میں درج کرائی گئیں اور ایسا کرانے والے لوگوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کی اپیل کی گئی مگر عدالت نے بیس سال بعد اس مقدمے کو مسترد کر دیا۔ جس کے خلاف راجستھان کے علاقے میں غم وغصے کا اظہار کیا گیا اور سرکردہ خواتین کی جماعت نے دوبارہ اپیل کی کہ اس رسم پر پابندی لگائی جائے۔ اس رسم سے متعلق نتیجہ کے طور پر ایل۔ ایم۔ باشم لکھتے ہیں:

زندہ جلنے یا جلانے کی یہ رسم ہمیشہ فکری اعتبار سے خود اختیاری رہی ہے، لیکن اگر ہم بعد کی مثالوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ معاشرتی اور خاندانی دباؤ نے اونچی ذات کی عورتوں بالخصوص جنگجو طبقہ کی عورتوں کو خود سوزی کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی کا سیاح نکولا دے کانتی کا بیان ہے کہ وجیانگر کے بادشاہوں کی کم وبیش تیس ہزار بیویوں اور کنیزوں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے آقا کی موت پر اس کے ساتھ جل جائیں گیں۔ [۹۶]

طلاق

طلاق کے ذریعے ہی شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ہوتی ہے۔ ہندو دھرم میں طلاق کی گنجائش نہیں، بلکہ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ دونوں زندگی کے آخری حصے تک رشتہ ازدواج میں منسلک رہیں۔ اگر شوہر کے اندر برائیاں موجود ہوں تو بھی وہ برداشت کرے۔ البتہ شدید مطالبے پر طلاق کی گنجائش کا ثبوت کہیں کہیں ملتا ہے۔ پھر نان ونفقہ کا ذمے دار شوہر ہوتا تھا مگر وہ عورت دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ اگر بیوی بد چلنی کی راہ اختیار کیے ہوئی ہے تو طلاق دینے کا حق مرد کو حاصل تھا اور ان شادیوں کے بارے میں کسی حد تک طلاق کا حکم تھا جو پورے طور پر مذہبی رسم کے مطابق انجام نہ دی گئی ہوں۔ عدم مطابقت پر طرفین کی رضامندی سے طلاق واقع ہو سکتی تھی۔ اسی طرح اگر میاں بیوی میں سے کسی ایک کو فی الحقیقت جسمانی خطرہ لاحق ہو تو بھی طلاق کی گنجائش تھی۔ منو کے قانون میں طلاق کی ایک خفیف شکل کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر عورت بانجھ ہو یا صرف لڑکی پیدا کرتی ہو یا شوہر کے ساتھ بے وفائی کرتی ہو تو شوہر اسے طلاق دے سکتا ہے۔ [۹۷]

وراثت

شروع ہی سے ہندوستانی معاشرے میں وراثت کا مسئلہ بڑا پیچیدہ اور غیر منصفانہ رہا ہے۔ عورتیں باپ کی جائداد میں حصے سے محروم تھیں۔ منو کے قانون میں لڑکی کا حصہ بھائی کے حصے کا چوتھائی مقرر کیا گیا ہے، جو شادی

۹۶- باشم، مرجع سابق، ۲۶۰۔

۹۷- نفس مرجع، ۲۳۷۔

سے پہلے اس کی پرورش اور جہیز کی خریداری میں صرف کیا جاتا تھا، لیکن شادی کے بعد بیٹی باپ کی جائداد میں حصے کی حق دار نہیں رہتی۔ اگر بیوہ ستی نہ ہوئی ہو اور وہ زندہ رہنا پسند کرتی ہو تو مرنے والے کے ورثا اس کے نان ونفقہ کا انتظام کریں۔ اگر مرنے والا کوئی وارث نہ چھوڑتا تو بعض اوقات بیوہ کو شوہر کی جائداد اور مال کا مالک بھی قرار دیا جاتا تھا۔ البتہ شادی کے بعد وہ کچھ حقوق کی ضرور مستحق سمجھی جاتی تھی۔ مثلاً استری دھن یعنی وہ تحفہ جو شوہر شادی کے وقت اپنی مرضی سے کچھ بیوی کو دیتا ہے۔ اس تحفے کو شوہر واپس نہیں لے سکتا تھا، لیکن اگر عورت خود چاہتی تو اسے واپس کر سکتی تھی۔ دوسرے وہ تحفے تحائف جو اس کا شوہر یا بیٹے اسے وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے۔ تیسری وہ رقم جو شوہر کو اپنی دوسری شادی کے موقع پر پہلی بیوی کو ادا کرنی ہوتی تھی۔ اس کی مالک عورت ہی ہوتی تھی۔[۹۸]

وارثوں کے متعلق جو صرف مرد ہو سکتے ہیں اصول یہ تھا کہ سب سے نیچے والوں کا حق زیادہ قوی ہے اور وہ بہ نسبت اوپر والوں کے ترکے کے زیادہ مستحق ہیں۔ یعنی بیٹا اور بیٹے کی اولا کو باپ دادا پر ترجیح دی جاتی تھی۔ میت کے اوپر یا نیچے کے قریبی رشتہ دار زیادہ مستحق تھے مثلاً بیٹا بہ نسبت پوتے کے اور باپ بہ نسبت دادا کے زیادہ مستحق ہے۔[۹۹] جو لوگ نسبت کے سیدھے سلسلے سے ادھر ادھر ہٹ گئے ہیں جیسے بھائی وہ ضعیف ہیں اور صرف اس وقت وارث ہوتے تھے، جب قوی وارث نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیٹی کا بیٹا بہن کے بیٹے سے اور بھائی کا بیٹا ان دونوں سے زیادہ مستحق تھا۔[۱۰۰] اگر ایک جنس کے متعدد وارث ہوں مثلاً متعدد بیٹے یا بھائی تو سب کے درمیان حصہ مساوی تقسیم ہوگا۔ ہندوؤں میں خنثیٰ (یعنی وہ شخص جس میں مرد اور عورت دونوں کی علامت ہوتی ہے) مردوں میں داخل ہے۔[۱۰۱]

لباس اور پردہ

قدیم ہندوستان میں پردے کا کیا رواج تھا اور عورتیں کن حدود و قیود کی پابند تھیں، اس بارے میں متضاد آرا کا پتا چلتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ قدیم ہندوستان میں پردے کا رواج بالکل نہیں تھا، جب کہ بعض شہادتیں

۹۸- نقوی، ہمارا قدیم سماج، ۱۲۸۔

۹۹- ابوالریحان البیرونی، **تحقیق ماللهند من مقولة مقبولة فی العقل أو مرزدلة** (حیدر آباد: معارف عثمانیہ، ۱۹۵۸ء)، ۴۷۵-۴۷۶۔

۱۰۰- نفس مصدر، ۳۸۰۔

۱۰۱- نفس مصدر، ۳۸۰۔ لڑکوں، لڑکیوں، شوہر، بیوی اور دیگر اقربا کی تقسیم وراثت کے تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو:
W.H. Mecaghlen, *Principales and precedents of Hindulaw*, Tranclated into urdu Lala Mookand hall (Agra: Musderwn Navadir), 1-2: 186.

ایسی بھی ملتی ہیں جو پردے کی عمدہ مثال اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم ہندوستان میں عورتوں کا لباس سادہ ہوتا تھا۔ چوں کہ آریا خانہ بدوشی کی زندگی بسر کررہے تھے، اس لحاظ سے یہ رائے درست ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ پردے پر دھیان نہ دیتے تھے۔ آج بھی ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں بعض گاؤں اور قبیلے ایسے ہیں جن کی عورتیں جسم چھپانے کے لیے مخصوص طرز کا لباس زیب تن نہیں کرتیں اور غیر مردوں کے سامنے بے جھجک آتی جاتی ہیں۔

آثار قدیمہ سے جو تفصیلات دست یاب ہوتی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ عورت اور مرد جسم چھپانے کے لیے کپڑے کا استعمال کرتے تھے۔ عورتیں ساڑھی کا استعمال کرتی تھیں اور سینے کے پردے کے لیے بلاؤز نما قمیض پہنتی تھیں۔ وہ اتنے چھوٹے ہوتے کہ کام کرتے وقت ستر عورت ظاہر ہوجاتا مگر مکمل عریانیت نہ تھی۔ رہی بات پردے کی تو ان کے اندر پردے کا رواج نہ تھا۔ عورتیں پردے کے بغیر محفل اور مجلس میں شریک ہوتی تھیں۔ عرب سیاح ابوزید اور تاجر سلیمان لکھتے ہیں: ”عورتیں غیر ملکیوں کے سامنے آتی جاتی ہیں اور مردوں کے دوش بدوش تفریحی جلسوں میں شرکت کرتی ہیں۔ ہندوستان کے اکثر راجہ جب دربار کرتے ہیں تو اپنی عورتوں کو اپنے پاس بلالیتے ہیں۔ اس طرح تمام دربار کے لوگ ملکی ہوں یا غیر ملکی، انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اپنا چہرہ نقاب وغیرہ سے نہیں ڈھکتیں۔“(۱۰۲)

راماین اور مہابھارت کی رزمیہ داستانوں سے پتا چلتا ہے کہ اس عہد میں پردے کا رواج بہت تھا اور شدت سے اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ رام چندر جی جب بن باس کے لیے نکلے تو سیتا کو یوں ہی عام عورتوں کی طرح لے کر نکلے، تو لوگوں نے شور مچایا کہ کیا برا وقت آگیا ہے کہ سیتا رانی کو آج سارے لوگ دیکھ رہے ہیں، جب کہ آج سے پہلے سیتا کو کبھی آسمانی دیوتا بھی نہ دیکھ پائے تھے۔(۱۰۳) دراصل اس قسم کے واقعات اعلیٰ طبقے کی عورتوں کے پردے کی نشان دہی کرتے ہیں، ورنہ عام رواج تھا کہ عورتیں دوسرے مردوں سے چہرہ نہیں چھپاتی تھیں۔ پردے کا رواج ہندو معاشرے میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے شروع ہوا۔(۱۰۴) دھیرے دھیرے وہ لوگ پردے پر سختی سے عمل کرنے لگے۔ رابندر ناتھ ٹیگور لکھتے ہیں: ”ان کے بچپن تک بنگال کی شریف ہندو عورتیں اتنا سخت پردہ کرتی

۱۰۲۔ گیلانی، مرجع سابق، ۸۷؛ نقوی، ہمارا قدیم سماج، ۱۲۹۔

۱۰۳۔ گیلانی، مرجع سابق، ۸۴؛ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ہندومت، ۱: ۴۹-۷۶۔

۱۰۴۔ گلمپز آف دی ورلڈ ہسٹری، بحوالہ نقوی، ہمارا قدیم سماج، ۱۲۹؛ قتیل، ہفت تماشا، ۴۲۔

تھیں کہ انھیں گنگا اشنان کرنا ہوتا تھا تو پالکی میں سوار ہو کر جاتی تھیں جس پر چاروں طرف سے پردہ پڑا رہتا تھا اور انھیں پالکی سمیت دریا میں غوطہ دیا جاتا تھا۔"(۱۰۵)

اس سب کچھ کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قدیم ہندو معاشرے کی عورتیں یا مرد حدود و قیود کا خیال نہیں رکھتے تھے اور دور جدید کے لڑکوں اور لڑکیوں کی طرح بے باکانہ طور پر خلوت میں ملتے تھے، عشق و عاشقی کی داستان قائم کرتے تھے اور زناکاری اور بدکاری میں بڑھے ہوے تھے، بلکہ عورتوں کی لاکھ مذمت کے ساتھ ان کی عزت و عصمت محفوظ تھی اور غلط کار مرد اور عورت کے لیے سخت سزائیں تھیں۔(۱۰۶) ایل۔ ایم۔ باشم لکھتے ہیں:

> مسلمانوں کے عہد میں شمالی ہندوستان کے ہندوؤں نے پردے کے رواج کو اپنا لیا جس کے تحت بالغ ہونے سے لے کر ضعیف العمری تک عورتیں اپنے شوہروں اور قریبی اعزہ کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں ہوتی تھیں لیکن شادی شدہ عورتوں کو جو آزادی بخشی گئی تھی اس میں چند علما نے مبالغہ سے کام لیا ہے اور یہ بھی صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ بعد کے ہندوؤں میں جو رواج آ گئے تھے، ان کے قابل اعتراض پہلو قدیم ہندوستانی تمدن میں کوئی مقام نہیں رکھتے۔(۱۰۷)

فاحشہ عورتیں

ہندو سماج میں فاحشہ عورتوں کی کثرت کا بھی پتا چلتا ہے اور ہندوستان میں پیشہ ور فاحشہ عورتوں کے لیے سزائیں نہیں تھیں اور اگر بعض وقت سزائیں دی جاتیں تو بڑی ہلکی ہوتی تھیں، کیوں کہ ہندو مندروں میں پیشہ ور عورتوں نے ناچنے گانے کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا، خاص کر ان مندروں میں ایسی عورتوں کی کثرت ہوتی، جہاں شیوجی کی مورتی نصب ہوتی تھی۔ البیرونی نے لکھا ہے:

> اس معاملے میں قصور قوم کا نہیں، بلکہ راجاؤں کا ہے۔ اگر راجاؤں کے حکم کی مجبوری نہ ہوتی تو کوئی برہمن یا پجاری اس کو گوارہ نہ کرتا کہ اس کے مندر میں فاحشہ عورتیں ناچیں اور گائیں۔ راجا عورتوں کو محض اس لیے روا رکھتے ہیں کہ ان کی رعایا تفریح کی غرض سے جوق در جوق مندر میں جائے اور حکومت کے لیے مالی منافع کا باعث بنے۔ اس کاروبار میں سے جتنی رقم وصول ہوتی، راجا اسے اپنے فوجی مصارف کے لیے کام میں لاتے ہیں۔(۱۰۸)

105- Krishna Kirpalani Rabindra noth Tagore, *A. Biography* (London, 1962), 18.

۱۰۶- باشم، **ہندوستان کا شاندار ماضی**، ۲۴۷؛ گستاؤلی بان، **تمدن ہند**، ۲۳۵۔

۱۰۷- باشم، مرجع سابق، ۲۴۶-۲۴۷۔

۱۰۸- بحوالہ سالک، **مسلم ثقافت ہندوستان میں**، ۳۷۔

تجہیز و تکفین کے مراسم اور طریقے

مردوں کی تجہیز و تکفین میں خاصا تکلف کیا جاتا تھا۔ پہلے مردے کے بال اور ناخن کاٹے جاتے تھے۔ چتا جلانے سے پہلے مردے کو سیاہ ہرن کی کھال پر لٹایا جاتا تھا۔ برہمن ہوتا تو اس کے ہاتھ میں عصا، چھتری ہوتا تو کمان، ویش ہوتا تو انکش رکھ دیا جاتا اور پھر توڑ کر چتا میں ڈال دیا جاتا تھا۔ چتا میں آگ لگانا سب سے بڑے لڑکے کا فرض تھا۔ مردے کے ساتھ ایک گائے یا بکری بھی جلائی جاتی تھی۔ اس کے بعد تمام عزیز رشتے دار اشنان کرتے تھے۔ کسی جگہ پر بیٹھ کر شام کو ستاروں کے نکلنے تک زندگی اور دنیا کی بے ثباتی پر وعظ سنتے اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر گھروں کو واپس جاتے تھے۔ جس گھر میں موت ہوتی وہاں عموماً تین دن لوگ زمین پر سوتے اور گوشت کھانے سے پرہیز کرتے تھے۔ موت کے بعد پہلی رات کو ایک روٹی مردے کی نذر کی جاتی اور کچھ پانی انڈھیل دیا جاتا تھا۔ گھر کے باہر ایک ہانڈی میں دودھ اور پانی رکھ کر مردے سے کہا جاتا اس میں آ کر نہالے۔ معمولاً دسویں روز مردے کی خاک اور ہڈیاں جمع کر کے ایک برتن میں رکھی جاتیں اور رگ وید کا یہ اشلوک پڑھتے ہوئے "جا اپنی دھرتی ماتا کے پاس" ندی اور سمندر میں ڈال دیتے تھے۔ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے تک مقررہ اوقات پر مردے کی روح کے آرام و سکون کے لیے مختلف رسمیں ادا کی جاتیں تھیں۔[۱۰۹] کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ آج بھی یہ رسم ہندو معاشرے میں جاری و ساری ہے۔ ہڑپہ کے لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔ جب کہ قدیم آریہ اپنے مردوں کی جلی ہوئی ہڈیوں کو دریا میں بہانے کے بجائے دفن کر دیتے تھے۔ چھوٹے بچے کو دفن کیا جاتا تھا۔ جو لوگ ریاضت میں اپنی زندگی ختم کر دیتے تھے ان کو اور جنوبی ہند کے ادنی طبقہ کے لوگوں کو بھی دفن کیا جاتا تھا۔[۱۱۰] قدیم زمانے میں عام طور سے مردوں کو دفنانے اور کفنانے کے تین طریقے تھے۔ باقاعدہ دفنانا، چرند و پرند کی نذر کر کے دفنانا، جلانا اور بعد ازاں چتا کی راکھ کو دفن کرنا۔[۱۱۱] مگر یہ تعجب خیز بات ہے کہ ہندو مردوں سے خوف زدہ رہتے اور ان کے متعلق مختلف نظریات بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی لاش کو چنڈال شمسان (مرگھٹ) تک لے جایا کرتے تھے۔

۱۰۹۔ گستاؤلی بان، مصدر سابق، ۵۸۔

۱۱۰۔ باشم، مرجع سابق، ۲۴۳-۲۴۴۔

۱۱۱۔ ترپاٹھی، قدیم ہندوستان کی تاریخ، ۴۷۔

تہوار

رگ وید میں دھرم کے جو اشارے ملتے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو دھرم میں عبادت کا تعلق مظاہر قدرت سے ہے اور جن دیوتاؤں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں زیادہ تعداد جنگ جو دیوتاؤں کی ہے۔ انڈو آریا قوم کو اپنے سلسلے میں نسل کے اعتبار سے برتری کا احساس تھا، اس لیے وہ ہندوستان کی مفتوح قوموں سے رشتہ ازدواج تو قائم کرنا چاہتے تھے، مگر مذہبی عقائد کے سلسلے میں انھوں نے فراخ دلی سے کام لیا اور بہت سے مذہبی عقائد اپنا لیے۔ آریاؤں کے ہندوستان میں جم جانے کے بعد شمال اور مغرب سے ایرانیوں، یونانیوں، ہنس اور بحر اسود کی تورانی قوموں کی ہندوستان میں آمد کافی عرصے تک جاری رہی اور وہ ابتدائی آریوں پر غالب ہوتی رہیں۔ چناں چہ آج کے ہندو انھی تمام مختلف قوموں کی اولاد ہیں اور اس لیے ہندو تہوار بھی انھی نسلوں کے مجموعی مذہبی عقائد کا نتیجہ ہیں۔ جب ذات پات کی تفریق بڑھی تو مذہبی رسوم اور تیوہاروں کے خدوخال میں بھی علاقائیت اور مخصوص برادری یا ذات پات کی انفرادیت کا رنگ نمایاں ہو گیا اور علاقائی تہواروں کا رنگ ڈھنگ قومی تہواروں سے کافی بدل گیا۔ (۱۱۲)

مسلمانوں کو چھوڑ کر پورے ہندو معاشرے پر غور کیا جائے، چاہے وہ ہندو ازم ہو یا بدھ دھرم یا جین ازم یا سکھ مت یا اور دیگر مذاہب، ان سب کے تہواروں کی اتنی کثرت ہے کہ اگر ان سب کو شمار کیا جائے تو سال کے ۳۶۰ دنوں سے زیادہ تہواروں کی تعداد ملتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے ہندو سماج دوچار ہے؛ اگر کرے تو بے جا اسراف اور نہ کرے تو مذہب سے انحراف اور سماج میں اکیلا پن کا مظاہرہ، خاص طور سے غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے ان تہواروں کا بجالانا بڑا ہی مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ چند مشہور تہواروں کے نام یہ ہیں:
دیوالی، دسہرا، (غالباً اسے ہی درگا پوجا، نوراتری، رام لیلا کہا جاتا ہے جو علاقائیت پر منحصر ہے) ہولی، شیوراتری، تیج، جنم اشٹمی، گنیس چترتھی، گن پتی، رکشابندھن، ناریل پورنیا، سلونو، رام نومی، بسنت پنچمی، مکر سکرانتی، پونگل، لوہری، اونم، بھیادوج، اکادشی، تلسی لگن، ہنومان جنتی، بیساکھی، ناگ پنچمی، گڈی پاور او غیرہ۔ (۱۱۳)

خورونوش کی پابندی

مورخین کا کہنا ہے کہ ہندوؤں میں برہمن ایک ایسی ذات تھی جو کہ شراب سے کلی اجتناب کرتی تھی۔ البتہ وہ جانوروں کا گوشت کھاتے تھے۔ مگر جین اور بدھ مت کی تعلیمات اور ان کے تبلیغی اثر سے ہندوؤں نے

۱۱۲- ماہ نامہ گگن، مذاہب عالم نمبر، ۸۶۶۔

۱۱۳- نفس مرجع، ۸۶۶-۸۹۴؛ قتیل، ہفت تماشا، ۷۵- ۹۴؛ علی احمد حکمت، سرزمین ہند، ۲۰۳-۲۰۸۔

گوشت خوری ترک کر دی۔ البتہ بعض علاقوں کے ہندو ہمیشہ گوشت کھاتے رہے۔ ان میں پنجاب اور کشمیر کا علاقہ شامل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بدھ مت اور جین مت کے کم زور ہو جانے کے بعد مجموعی طور پر ہندوؤں نے گوشت کھانا شروع کر دیا تھا۔ قدیم ہندو گائے کا گوشت بھی کھالیتے تھے، چوں کہ ہندوؤں میں سوختی قربانی کا بھی رواج تھا، اس لیے قربانی کے لیے گائے اور دوسرے جانوروں کو بھی بھینٹ چڑھاتے تھے۔ البیرونی کے بیان کے مطابق: بکری، بھیڑ، ہرن، خرگوش، گینڈا جس کے ناک درست ہوتے ہوں، بھینس، مچھلی اور پانی کے پرندے مباح ہیں اور خشکی کے پرندوں میں گوریا (چڑا) فاختہ نیز کبوتر اور ہر وہ چڑیا جس سے طبیعت کو کراہت نہ ہو اس سے ممانعت نہیں۔ جن چیزوں کی حرمت پر صریح حکم موجود ہے وہ گائے، گھوڑا، خچر، گدھا، اونٹ، ہاتھی، بلی بلوتی، مرغی، کوا، طوطا، کوئل اور بلا استثنا سب کا انڈا اور شراب ہیں۔[۱۱۴] البیرونی نے صراحت کی ہے کہ ایک زمانے تک ہندوؤں کے یہاں گائے حلال تھی مگر کسی مصلحت کی بنا پر بعد میں حرام کر دی گئی۔ شودر کے لیے شراب پینا جائز تھا اور بیچنا حرام اور اسی طرح گوشت بیچنا بھی حرام تھا۔[۱۱۵] کسی زمانے میں چاروں ذاتوں کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ مگر جب ذات پات کی تفریق سخت ہو گئی تو الگ الگ اپنی ذات میں لوگ کھانا کھانے لگے۔

قانون و سزا

ہندوؤں کے یہاں اگر کوئی آدمی کسی گناہ میں ملوث ہوتا یا قانون کی خلاف ورزی کرتا یا چوری ڈکیتی کرتے ہوئے پکڑا جاتا، تو اس کے لیے کئی طرح کی سزائیں تجویز کی جاتیں جو بعض اوقات بڑی بھونڈی ہوتی تھیں۔ مثلاً ملزم یا مدعا علیہ سے کہا جاتا کہ زہر پی لو، اگر تمھارا بیان صحیح ہو گا تو زہر تم کو کوئی نقصان نہ پہنچائے گا۔ یا پھر کنویں کے پاس لایا جاتا اور اس میں کودنے کے لیے کہا جاتا۔ اسی طرح متنازعہ صورت میں مدعا علیہ کو کسی بڑے مندر میں بھیج دیا جاتا اور حکم دیا جاتا کہ ایک دن کا برت رکھے، پھر دوسرے دن صاف ستھرے کپڑے پہنا کر مندر میں کھڑا کیا جاتا، پجاری مندر کی مورتی پر پانی ڈالتے اور مورتی کا غسالہ اس کو پلایا جاتا، اگر وہ جھوٹا ہوتا تو فی الفور خون کی قے کر دیتا۔ ایک آزمائش یہ بھی تھی کہ مدعا علیہ کو ترازو سے تولا جاتا۔ پھر وہ آسمانی دیوتاؤں اور مقدس ہستیوں کو ایک ایک کر کے اپنی صداقت پر گواہ کرتا اور کاغذ کے پرچے پر ان سب کا نام لکھ دیا جاتا، اس کے بعد دوبارہ ترازو میں

۱۱۴۔ البیرونی، مصدر سابق، ۴۶۷-۴۶۸۔

۱۱۵۔ نفس مصدر۔

رکھا جاتا۔ اگر وہ سچا ہوتا تو اس دفعہ اس کے وزن میں اضافہ ہو جاتا۔ اسی طرح مدعا علیہ کا ایک امتحان یہ ہوتا کہ اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر چاول بکھیر دیا جاتا اور کسی چیز کا ایک چورا بنا کر اس چاول پر رکھ کر اس پر ایک گرم اور تپتا ہوا لوہے کا ٹکڑا ڈال کر اس سے کہا جاتا کہ سات قدم چلو اور پھینک دو، اگر ہتھیلی کو کوئی گزند نہ پہنچتا تو اسے سچا مانا جاتا تھا۔(۱۱۶)

اگر کوئی برہمن کسی دوسرے کو قتل کر دیتا تو اس کی سزا صرف برت رکھنا ہوتا یا وہ پرا تھنا اور دان پن کرتا۔ اگر برہمن برہمن کو قتل کر دیتا تو اس کا کوئی کفارہ نہ ہوتا اور اگر دوسری ذات والے لوگ کسی کا قتل کر دیتے تو اسے سخت سے سخت سزائیں دی جاتیں۔ مثلاً اس کا قتل کر دیا جاتا، جائداد ضبط کر لی جاتی، ملک بدر کر دیا جاتا یا اندھا کر دیا جاتا تھا۔

اصلاح وترمیم کی ضرورت

ہندوازم کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ اور برہمنوں کا سماجی تفوق پورے ملک پر گہرا ہونے کے باوجود مذہب کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی جارہی تھی اور وید و اپنیشد کی تعلیمات بے جان ہو کر رہ گئی تھیں۔ صرف رسوم اور تقاریب کا انجام دینا ہی مذہب رہ گیا تھا۔ گوشت خوری عام ہو چکی تھی۔ ذات پات کی تفریق نے نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کو مشکل سے مشکل بنا دیا تھا۔ کثرت پرستی کا عقیدہ وحدت پرستی کی منزل طے کرتا ہوا وحدت الوجود اور ہمہ اوست کی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ گویا کہ چھلکے کے اندر مغز باقی نہیں رہا اور خالی چھلکا عوام کے درد کا درمان نہیں بن سکا۔ آخر کار قانون قدرت کا عمل ایک مرتبہ پھر ظاہر ہوا اور جو ریاضت معبود حقیقی کے پہچاننے اور نجات حاصل کرنے کے واسطے کی جاتی تھی وہ محض دکھانے کے لیے یا حصول نام ونمود کے لیے کی جانے لگی، لہٰذا لوگوں نے مذہبی تعلیمات اور بڑھتی ہوئی اونچ نیچ کے اصول و ضوابط اور ریاضت و قربانی اور عبادت کے طریقوں میں اصلاح وترمیم کی ضرورت محسوس کی۔ یہاں تک کہ انھیں ذلیل وپست قوم کے دو سپوتوں نے کمر ہمت باندھی اور وہ اس راہ میں کود پڑے۔ جن کی تعلیمات وتلقینات نے کافی حد تک فرسودہ قدیمی روایت پر کاری ضرب لگائی اور لوگوں کے لیے ایک نشان راہ متعین کیا۔ جن میں جین اور بدھ ازم قابل ذکر ہیں۔

۱۱۶- سالک، مرجع سابق، ۳۳-۳۴۔

بدھ ازم

گوتم بدھ اگرچہ پیدائشی طور پر ہندو تھے، مگر وہ ہندوؤں کی مروجہ باتیں تسلیم نہیں کرتے تھے، وہ کسی جاندار کی قربانی کے قائل نہ تھے، اور نہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کو تسلیم کرتے تھے۔[117] ان کا کہنا تھا کہ انسان

۱۱۷۔ اعجاز حسین، **مذہب وشاعری** (کراچی: اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۵ء)، ۲۶؛ مہاتما گوتم بدھ ۵۶۳ / ۵۴۳-۶۲۰ قبل مسیح ریاست کپل وستو کے راجا سدھودن کے یہاں لمبنی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بدھ کا خاندان شاکیہ قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی ماں مہامایا ریاست کلی کے راجا انجن کی بیٹی تھی۔ پیدائش کے وقت گوتم کا نام سدھارتھ رکھا گیا اور خاندانی نام گوتم پڑا۔ گوتم کی پیدائش کے ساتویں دن اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ باپ نے اپنی سالی گوتمی سے شادی کرلی جس کی گود اور تربیت میں گوتم بدھ پلے بڑھے۔ ۱۹ سال کی عمر میں ماموں زاد بہن گوپا سے گوتم کی شادی ہوگئی۔ ۲۹ برس کی عمر میں ایک اہم واقعہ کو دیکھ کر گوتم اپنی ازدواجی زندگی سے دور ہوگئے۔ (ستادلی بان، **تمدن ہند**، ۲۴۸-۲۴۹؛ دھرمانند کوسمبی، **بھگوان بدھ** (دہلی: ساہتیہ اکادیمی، ۱۹۶۰ء) ۱۳۹)، اور ایک نئی زندگی کی تلاش کرنے میں سرگرداں ہوگیے۔ وہ اس بات کی کھوج لگانا چاہتے تھے کہ زندگی اور اس کا مقصد کیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے زمانہ کے بڑے بڑے علما سے ملاقات کی، مگر کوئی ان کو مطمئن نہ کرسکا۔ پھر انھوں نے سخت ریاضت کی، لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ جسم کو تکلیف دینا اور نفس کشی کرنا بالکل بے کار ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے تلاش حق جاری رکھا۔ اس کے بعد وہ ریاست بہار میں گیا کے قریب ایک برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر سخت غور وفکر میں ڈوب گیے اور انسانی تکالیف کے اسباب اور ان کے علاج کے بارے میں غور وفکر میں محو ہوگیے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انسانی خواہشات ہی تمام تکلیفوں کی جڑ ہیں، جہل، طمع اور نفسانی خواہشات وہ ایندھن ہیں جن کے ذریعے سے انسانی جذبات کائنات میں آگ لگادیتے ہیں اور اسی دہکتی ہوئی بھٹی سے جس کا نام دنیا ہے بچ نکلنے کا نام نروان ہے۔ انھیں روشنی مل گئی اور وہ بدھ (عارف) کہلانے لگے۔ وہ گیان یہ تھا:

"تم نہ کوئی جنم بھومی ہو اور نہ کوئی کنبہ، نہ ذات، نہ جیو، نہ ضمیر، تم بدھ (دانش) ساہو، تم سے پہلے جو بدھ دنیا میں آتے رہے ہیں، تم اس سلسلے کے آخری بدھ ہو۔" (ماہ نامہ گگن، ص: ۱۷۱)۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ ہو جانے کے بعد گوتم ذرم (درخت کا نام جس کے نیچے بیٹھ کر عرفان حاصل کیا تھا) کے نیچے دو ہفتے تک بیٹھے رہے، تیسرے ہفتے اس کے نیچے ٹہلنا شروع کیا، چوتھے ہفتے شمال مغرب کی طرف نکل گیے، پانچواں ہفتہ موچوکند کے درخت کے نیچے گزارا، چھٹا ہفتہ اجپالک کے نگر دودھ درخت کے سایے میں بسر کیا اور ساتواں ہفتہ ایک تار کے درخت کے نیچے۔ اس پورے عرصہ میں گوتم نے کچھ نہیں کھایا۔ آٹھویں ہفتہ میں کھانا شروع کیا۔ مہاتما بدھ نے اپنا پہلا وعظ بنارس کے قریب سارناتھ میں دیا اور سب سے پہلے اپنے پانچوں بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنایا۔ جنھوں نے ابتدائی ریاضت کے زمانہ میں ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ تین ماہ تک بدھ نے بنارس میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں ساٹھ آدمی حلقہ میں آگیے اور جب کیشپ نے بدھ مذہب قبول کیا تو بے شمار

خود اپنی اصلاح کرے اور کسی غیبی طاقت کا محتاج نہ بنے۔ وہ سخت ریاضت کے بھی مخالف تھے۔ ہندو مذہبی صحیفوں کی رو سے انسان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ روح خالق حقیقی سے جا ملے۔ مگر گوتم بدھ روح کو خدا کا جز نہیں مانتے تھے۔ موت اور پیدائش کے سلسلے کو ختم کرنے کا ذریعہ ان کے نزدیک نروان ہی تھا۔ یعنی انھوں نے آواگون کے ہندو فلسفے کو قدرے بدل کر مانا۔ اور یہی چیزیں ان کی تعلیمات کی بنیاد ہیں۔ پنڈت منوہر لال زتشی لکھتے ہیں کہ:

> کرم اور آواگون یا تناسخ کے مسائل پر گوتم بدھ کی تعلیم کی بنا تھی جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا اور اچھے برے دونوں طرح کے افعال کے نتائج کا بھگتنا لابدی ہے، اور اسی واسطے ہر روح کو بار بار دنیا میں جنم لینا پڑتا ہے۔ اچھے کرم کے صلے میں اگر بہشت بھی نصیب ہوئی تو مقررہ مدت کے بعد پھر دنیا میں پیدا ہونا پڑے گا اور دنیا کے رنج اور خوشی، مسرت اور صعوبت برداشت کرنی پڑے گی۔ اگر غور سے دیکھیے تو جو چیز انسان کو دنیا سے وابستہ رکھتی ہے اور اس جھگڑوں سے آزاد نہیں ہونے دیتی، وہ "ترشنا" یا خواہش ہے۔ پس نفس امارہ کا مارنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اعتدال کی زندگی سب سے اچھی ہے۔ نہ نفس امارہ کی غلامی اور نہ اس طرح کی ریاضت جس میں جسم اور جان کو طرح طرح کی ایذا پہنچائی جائے۔ والدین اور گرو کی اطاعت اپنے نفس پر قابو، ہر انسان کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ اور ساری کائنات پر ترحم کی نگاہ، بدھ مت کے یہ چار خاص اخلاقی اصول ہیں اور ان کی پابندی سے وہ اعتدال و سکون حاصل ہو سکتا ہے جو نروان یا نجات کا ذریعہ ہے۔ (۱۱۸)

انھیں حقائق کو بنیاد بناتے ہوئے گوتم بدھ نے انسانی زندگی کے لیے اصول ہشت گانہ کو پیش کیا جو دراصل ان بنیادی حقائق کی تشریح و توضیح ہے جو انسان کے صحیح فکر اور صالح عمل کے لیے مہمیز بنتے ہیں:

۱۔ صحیح کلام ۲۔ صحیح عمل ۳۔ صحیح معاش ۴۔ صحیح سعی اور جدوجہد
۵۔ صحیح استحضار ذہنی ٦۔ صحیح ارتکاز ۷۔ صحیح آرا ۸۔ صحیح فکر۔ (۱۱۹)

بدھ کے ان اصول ہشت گانہ پر غور کیا جائے اور ان کا مقابلہ ہندوازم کی مذہبی کتابوں اور رہ نمایان ہندو مت کی تعلیمات سے کیا جائے تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ بدھ نے لوگوں کے سامنے ہندو مذہب کی

چیلے بدھ مت میں داخل ہو گیے۔ (ایضا) بتدریج بدھ مذہب کے متبعین کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور اس کا شمار دنیا کے تین بڑے مذاہب میں ہونے لگا، اور وہ لنکا سے جاپان تک اور ایشیا کے بہت سے ملکوں میں پھیل گیا۔

بدھ نے ادنی، اعلی ہر ذات سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنا مرید بنایا اور سب کو مساوی درجہ دیا۔ البتہ مریدین کے دو گروہ کر دیے تھے۔ ایک گداگر، دوسرے اہل دنیا، اور دونوں کے لیے الگ الگ قواعد و ضوابط بنائے۔

۱۱۸۔ محسن عثمانی، **ہندو مذہب**، ۲٦ ۔ ۲۷۔

۱۱۹۔ **مطالعہ مذاہب**، مضمون نگار: سن، ڈی، سلوا، ۷٦۔

تعلیمات و خیالات کو صیقل کر کے اور اس کو ایک نظام میں پرو کر پیش کیا جو اپنی شدت پسندی کی وجہ سے ناقابل عمل تھا۔ چناں چہ ریس ڈیوڈز کے حوالے سے ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے لکھتے ہیں:

ہندو رشیوں کے پراگندہ خیالات کو ایک نظام میں منضبط کرنے کی تحسین گوتم بدھ کو ملنی چاہیے اور یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ گوتم بدھ نے نہ صرف منتشر خیالات ہی کو ایک جامع ضابطہ میں ڈھالا، بلکہ ذات پات کا امتیاز عملاً موقوف کر کے دھرم کلیہ کو نہایت واضح صورت میں پیش کیا ہے۔ آپ ہمدردی اور مروت کے برتاؤ کا نمونہ ہیں۔ آپ نے پروہتوں کا زور توڑ کر ذات پات کے بندھن کاٹ ڈالے جس کی تحسین کے آپ ہر طرح مستحق ہیں۔[۱۲۰]

گوتم بدھ کی تعلیم و تلقین کا نمایا عنصر یہ بھی ہے کہ انھوں نے مساوات پر زور دیا، جسے سن اور دیکھ کر عوام ہندو دھرم کو ترک کر کے بدھ مذہب میں داخل ہوئے اور قید و بند کی زنجیر سے خود کو آزاد کر لیا۔ عورت جو برہمنی عہد میں ذلیل سے ذلیل وجود تھی اور جس کے لیے عبادت و ریاضت اور حصول نجات کی راہ موقوف ہوگئی تھی وہ بھی بدھ کی تعلیمات کے زیر اثر آگئی اور ایک گونہ اس کی زندگی میں تغیر و تبدیلی پیدا ہوگئی اور وہ پرسکون زندگی گزارنے لگی۔ مگر پھر بھی عورت کو گوتم بدھ وہ مقام نہ دلا سکے جس کی وہ مستحق تھی۔ مجموعی طور پر گوتم کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ انھوں نے مساوات کو عام کیا اور اسے گھر گھر پہنچایا، چناں چہ بدھ کی اس تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد مجیب رقم طراز ہیں کہ:

مساوات کی جو تعلیم بدھ مذہب میں ملتی ہے وہ کچھ اس کی معقولیت کا نتیجہ ہے، کچھ انسانی ہمدردی کے جذبے کا۔ گوتم بدھ کے زمانے میں جو بہت سے مذہبی فرقے تھے ان میں داخل ہونے کے لیے ذات پات کی کوئی قید نہیں تھی اور اس وقت یہ خیال عام تھا کہ نجات کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہے۔ گوتم بدھ کے پیش نظر معاشرے کی اصلاح اور سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا، اس لیے کہ سماجی اداروں کی اصلاح یا معاشرتی انقلاب کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے بس اتنا کیا کہ ذات پات کو انسانیت کا معیار نہیں مانا اور ان کے لیے مکالموں میں ثابت کیا گیا ہے کہ برہمن وہ نہیں ہے جو کہ برہمن کا بیٹا ہو، بلکہ وہ جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔ جو خود راہ راست پر چلے اور دوسروں کی بھی رہ نمائی کرے۔ مشرقی ہند میں برہمن سماج پر غالب ہوتے تو یہ تعلیم خود بخود ایک انقلابی تحریک بن جاتی۔ چوں کہ برہمن یہاں اپنی فضلیت تسلیم نہیں کرا سکتے تھے اس لیے گوتم بدھ کی یہ تعلیم ذاتوں کی تقسیم کو اصولی حیثیت سے رد کرنے کے کام آتی رہی، لیکن وہ ذات کے خیال کو مٹا نہ سکی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غالباً گوتم بدھ کے خاص چیلوں میں برہمنوں اور کستریوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی، لیکن سنگھ میں ذات یا پیشے کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ سنگھ میں ادنی ذات کے لوگ بھی تھے اور حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اعلیٰ اور ادنی ذات والوں کی نسبت خاصی تھی۔ گوتم بدھ نے کسی ایک ذات یا ادنیٰ ذاتوں کے لوگوں میں اپنی تعلیم پھیلانے کی کوشش نہیں کی اور جن

۱۲۰۔ رادھا سوامی، **ہندوستان سے ابھرے دیگر دھرم** (پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری)، ۳۱-۳۲۔

پیروؤں نے دنیا چھوڑ کر فقیری اختیار نہیں کی تھی انھیں ذات پات کی بندشوں کو توڑنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ میل جول میں گوتم بدھ ذات اور سماجی حیثیت کی پرواہ نہیں کرتے۔[۱۲۱]

بدھ کی تعلیمات کا اثر

بدھ کی تعلیمات نے ہندو دھرم پر جو اثرات ڈالے ان کا لب لباب مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ بدھ مت کے اثر سے ہندو سماج کی طبیعت میں نرمی پیدا ہوگئی، انسان کے دل میں نہ صرف انسان کے لیے نرمی پیدا ہوئی بلکہ انسان حیوانوں کے ساتھ بھی نرمی سے پیش آنے لگے۔

۲۔ ذات پات کی تفریق کو بدھ مت میں شدت کے ساتھ اور بار بار برا کہا گیا ہے۔ ذاتیں برقرار تو رہیں مگر ان کا کٹرپن ضرور کم ہوا۔

۳۔ ہندوؤں میں گوشت خوری بالکل ختم ہوگئی۔

۴۔ دان دینے کی ابتدا بدھ مت سے ہوئی، گوتم بدھ کے نزدیک بھیک خودی کو مٹانے کی بہترین صورت ہے۔

۵۔ ہندو حکمرانوں میں جنگ جوئی کا جذبہ بھی کم ہوا۔

۶۔ بدھ مت میں چوں کہ بت پرستی اختیار نہیں کی گئی، اس لیے ہندو عوام میں مہمل رسوم کو انجام دینے کا رجحان کم ہوا۔

۷۔ بدھ مت کے عہد میں فن طب میں بھی ترقی ہوئی۔ انسانوں کے لیے شفاخانے تو پہلے بھی تھے مگر بدھ کی تعلیم کے تحت حیوانوں کے لیے بھی ہسپتال کھلنے لگے۔

۸۔ پتھر کا استعمال پہلے صرف شہر کی فصیل بنانے میں ہوتا تھا، مگر بدھ کے عہد میں بڑی بڑی عمارتوں، خانقاہوں اور پاٹھ شالاؤں کی تعمیر میں پتھر کو بڑی نفاست سے استعمال کیا گیا اور پتھر کی نقاشی تو اپنے عروج پر پہنچ گئی، چناں چہ بدھ مت نے ہندو تہذیب کو فن تعمیرات سے بھی متعارف کرایا۔[۱۲۲]

بدھ مذہب کی توسیع اور اشوک

اشوک جو تقریباً ۲۶۸/۲۶۹ قبل مسیح میں ہندوستان کا فرماں روا ہوا۔ شروع میں اس نے حکومت حاصل کرنے کے لیے بہت سی خون ریز جنگیں لڑیں، یہاں تک کہ اس راستے میں اس کا بھائی بھی آیا تو اس سے بھی خون کی

۱۲۱۔ مجیب احمد، تاریخ تمدن ہند، ۱۰۰۔ ۱۰۱۔

۱۲۲۔ ماہنامہ گگن، مذاہب عالم نمبر، ۱۷۴۔ ۱۷۵۔

ہولی کھیلی۔ کلنگ کی جنگ اس کا بین ثبوت ہے، مگر اسی جنگ سے اس کے قلب میں بھونچال آیا اور وہ جنگ وخوں ریزی سے تائب ہوگیا۔ اس کا دل ودماغ اس وقت کے رائج مذہب بدھ مت کی تعلیم سے بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نے اس کے فروغ واستحکام کے لیے بہت سے اہم کام انجام دیے اور بے شمار استوپ بنائے۔ ایک مجلس اس نے اپنی تاجپوشی کے سترھویں سال پاٹلی پتر میں منعقد کی جس میں مختلف فرقوں کے لوگوں کو مدعو کیا اور باہمی اختلافات مٹانے پر زور دیا اور دوسرے فرقوں کے درمیان احترام اور باہمی رواداری کو فروغ دینے کی تلقین کی۔ اشوک نے پتھروں پر بدھ مت کے احکام کندہ کرائے، جنھیں بعد میں چل کر بدھیوں نے یک جا کر کے کتابی شکل دے دی جو بدھی صحائفِ کہلائے۔

بدھ مت کے زوال کے اسباب

ابتدا ہی سے برہمنی مذہب ہندوستان میں غالب رہا اور ذات پات اور اونچ نیچ کی تفریق کو گلے سے لگائے رکھا۔ عبادت اور ریاضت کی من مانی اور بھونڈی تفسیر وتعبیر کر کے لوگوں کو الجھایا۔ قربانی کی رسموں پر نہ صرف زور دیا، بلکہ اس کی انجام دہی کے لیے صرف برہمنوں کو خاص کر دیا۔ دان اور پن کی چیزوں پر قبضہ جمائے رہا۔ مجموعی طور پر ہندو دھرم اختلاف وانتشار کا شکار تھا کہ اچانک گوتم بدھ نے آکر ان کے اندر نئی جان پیدا کر دی۔ وہ ویدوں کا منکر ہو گیا، خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا، اونچ نیچ کی تفریق کو مٹایا، عبادت وریاضت کے طریقے میں میانہ روی کی راہ دکھلائی، تناسخ کا تو وہ قائل ضرور رہا مگر اس کے طریقے اور نظریات کو بدل دیا، مورتی پوجا کی تردید کی، قربانی کی رسموں کی مخالفت کی اور چاروں ذات کے لوگوں کو اس بات کی طرف راغب کیا کہ ذات پات کا امتیاز کہ وہ فلاں خاندان اور گھرانے میں پیدا ہوا ہے، بے معنی ہے، بلکہ امتیاز عمل کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ یہی وہ تعلیمات تھیں جن کی بنا پر بدھ مت بہت جلد ہندو مذہب پر غالب آگیا اور جوق درجوق لوگ اس کے حلقے میں داخل ہوتے گئے، یہاں تک کہ اشوک کے انتقال (۲۳۲ق م) کے بعد اس کا زوال شروع ہو گیا اور بتدریج ہندو مذہب اس پر غالب آگیا۔ اس کے زوال کے کئی اہم اسباب ہیں، جو تفصیل طلب ہیں، مگر اس سلسلے میں پنڈت منوہر لال زتشی نے بڑی اچھی معلومات فراہم کی ہیں جو مختصر بھی ہے اور لائق پذیرائی بھی؛ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

> بدھ مذہب کے زوال کے وہی اسباب تھے جو عموماً مذہبوں کے زوال کے ہوا کرتے ہیں، گوتم بدھ کی روحانی تعلیم کو تو لوگ بھول گئے اور اس کی جگہ بدھ کی مورتیوں کو پوجنے لگے۔ معنی اور مطلب فراموش ہوگئے، محض الفاظ کا گورکھ دھندا رہ گیا، اور الفاظ کے اختلاف پر فرقے اور جتھے قائم ہونے لگے۔ چوتھی صدی عیسوی میں جب گپت خاندان کے راجہ شمالی ہندوستان میں حکومت کرتے تھے، اس وقت بدھ مذہب کا زوال اور ہندومت کی نئی زندگی شروع ہوگئی تھی۔ آٹھویں

صدی عیسوی میں شنکر اچاریہ کے اقبال کا ستارہ چمکا اور اس کے وعظ اور تلقین کا یہ اثر ہوا کہ کدار ناتھ سے رامشیورم تک اور جگناتھ سے دوار کا تک ہندو مذہب کا ڈنکا بج گیا۔ مگر جو مذہب اب رائج ہوا وہ قدیم آرین مذہب سے مختلف تھا۔ ویدوں اور شاستروں کو اب بھی لوگ مانتے تھے اور ان کی عظمت کے قائل تھے مگر دلوں پر مہابھارت اور راماین کا سکہ چلتا تھا اور پرانے دیوتاؤں کی جگہ رام اور کرشن کے اوتاروں نے لے لی تھی۔ اس تبدیلی کے ساتھ بھگتی کے عقیدے کا رواج ہوا۔ کرم اور گیان "تپس" اور ریاضت سے لوگ واقف تھے اور ان کو برت چکے تھے۔ اب بھگتی نے لوگوں کے دلوں کو اور دلوں کے جذبات کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا، اور بارھویں صدی سے سولھویں سترھویں صدی تک جو مذہبی پیشوا پیدا ہوئے انھوں نے نہایت زور شور سے اسی عقیدے کو سراہا اور اس کی اشاعت کی۔ شالی ہندوستان میں رامانند اور اس کے چیلے کبیر، تلسی داس اور سورداس، بنگال میں چیتن، پنجاب میں نانک اور دکن میں تکارام اس بھگتی کے مذہب کو رواج دینے والے تھے۔ چوں کہ اس تحریک کے وجود اور اشاعت دینے والے اکثر ویشنو تھے، اس واسطے ہندوستان میں یہ تحریک انھی کے نام سے موسوم ہے اور انگریز مورخ بھی اس کو وشنوازم کہتے ہیں۔[۱۲۳]

مہاویر جین

مہاویر جین کی پیدائش ۵۹۹ قبل مسیح میں ایک چھتری گھرانے میں ریاست بہار کے شہر ویشالی میں ہوئی۔ باپ کا نام سدھارتھ تھا اور ماں کا نام ترشیلا دیوی۔ پیدائش کے بعد مہاویر کا نام وردھمان رکھا گیا، اور چوں کہ چھوٹی عمر ہی سے مہاویر نے بہادری کے کارنامے سرانجام دیے، اس لیے مہاویر کے نام سے مشہور ہوے۔ تعلیم و تربیت شہزادوں کی طرح ہوئی۔ دگمبر فرقے کے بموجب مہاویر جین نے شادی نہیں کی جب کہ سوئتمبر فرقے والوں کا کہنا ہے ان کی شادی یشودھا سے ہوئی تھی اور اس سے ایک بچی کا بھی جنم ہوا جس کا نام پریہ درشنی رکھا گیا۔ تیس سال کی عمر میں وہ گھر سے نکل گیے اور تارک الدنیا ہوگئے۔ بارہ سال تک سخت عبادت و ریاضت میں وقت لگایا۔ تیرھویں سال میں انھیں وہ روشنی مل گئی جس کے وہ متلاشی تھے۔ اس کے بعد نرگرنتھ یا جین کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ تیس سال انھوں نے جین مت کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کیے۔ ان کا دائرۂ تبلیغ خاص طور پر علاقہ مگدھ، متھلا اور کوشل تھا۔ اس دوران علاوہ معتقدین کے ان کے گیارہ خاص شاگرد بنے جنھوں نے مہاویر جین کے بعد جین مت کی اشاعت اور ترقی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ مہاویر جین کا انتقال سوئتمبر فرقے کے مطابق بہتر سال کی عمر میں ۵۲۷ قبل مسیح میں ہوا۔[۱۲۴] اور چوبیسویں تری تھنکر کہلائے۔ جس کے معنی پیغمبر یا اوتار کے ہیں۔

۱۲۳- محسن عثمانی، ہندو مذہب، ۲۹-۳۰۔

۱۲۴- ترپاٹھی، قدیم ہندوستان کی تاریخ، ۱۲۸۔

Ancient India, 92. *Ancient Culture of India*, 171-172.

مہاویر سے قبل تئیس تری تھنکر اس دنیا میں آکر لوگوں کو نجات اور موکس کی راہ دکھا چکے تھے۔ مہاویر کی تعلیمات میں سات بنیادی اصول بڑی اہمیت کے حامل ہیں، جنھیں سات بنیادی حقائق کا نام بھی دیا جاتا ہے۔(۱۲۵) جن کی توضیح و تشریح اور تفصیل میں جین علما نے فکر و خیال کی انتہائی قوتوں کو صرف کر ڈالا اور ان میں سے ہر موضوع کے اتنے پہلو اور امکانات تلاش کیے کہ جین دینیات ایک چیستاں بن گیا جن کا بیک وقت احاطہ ذہنی قوت کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے۔(۱۲۶)

جین مت کے خاص عقائد

جین مت والے ویدوں کو الہامی نہیں مانتے اور نہ قربانی کی رسموں کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کائنات کے چھوٹے چھوٹے ذرے میں بھی روح (جیو) ہوتی ہے۔ جس میں قدرت نے شعور بھی ودیعت کیا ہے۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جینیوں نے تمام جان داروں پر رحم کرنے کے اصول کی پابندی کی۔ جب اس پر سختی سے عمل درآمد ہو گیا تو عجیب متضاد صورتیں رونما ہوئیں۔ یعنی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جین راجا نے جانوروں کے جان سے مار ڈالنے والوں کو پھانسی کی سزا دی۔ جینی کسی عالم گیر روح یا قدرت مطلقہ کے قائل نہیں جو دنیا کی خالق ہو جس کے وجود کے باعث نظام کائنات قائم و برقرار ہو۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ "انسان کی روح میں جو طاقتیں مخفی ہیں پرماتما ان کا بہترین، بلند ترین اور مکمل ترین مظہر ہے۔ جینوں کے نزدیک زندگی کی منزل مقصود یہ ہے کہ انسان مادی وجود کے بندھن توڑ کر نجات حاصل کرے۔ روح کے جسمانی شکل اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ جسم میں "کرم" (عمل) کا مادہ موجود ہے۔ اس لیے جینی کرم سے چھٹکارا حاصل کرے تو اسے موکش (نجات) مل جائے گا پھر وہ آواگون کے چکر سے بھی محفوظ ہو جائے گا۔ اس منزل تک پہنچنا جواہر ثلاثہ (تری رتن) پر منحصر ہے۔ راسخ اعتقاد، حقیقی علم اور نیک چلن۔ جینی تپ، یوگی مشقوں اور فاقہ پر بہت زور دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جان بھی چلی جائے تو پرواہ نہیں کرتے۔ خیال یہ ہے کہ زندگی میں نظم وضبط روح کو طاقت پہنچاتا ہے اور مادہ اسفل کو تسخیر کر لیتا ہے۔(۱۲۷)

۱۲۵۔ اعجاز حسین، **مذہب و شاعری**، ۲۴۔

۱۲۶۔ **مطالعہ مذاہب**، مضمون نگار، عماد الحسن فاروقی، ۱۰۹-۱۱۰۔

۱۲۷۔ ترپاٹھی، مصدر سابق، ۱۲۷۔

مہاویر جین نے اپنے ریاضت کے زمانے میں جسم سے کپڑے کو بھی الگ کر دیا تھا۔ بعد میں جب ان کا انتقال ہو گیا تو اس کے دو بڑے فرقے وجود میں آئے، سوئتمبر اور دگمبر۔ دگمبر فرقے کے جینی نے برہنگی کو اختیار کیا اور مہاویر جین کے اس فلسفے کو اپنایا کہ جسم خود آتما یا روح کا لباس ہے اس لیے جسم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب کہ سوئتمبر فرقے کے لوگوں نے سفید لباس کو شعار بنایا۔ اسی آخری فرقے میں آگے چل کر کئی اور فرقے پیدا ہو گئے جو مورتی پوجا کے قائل نہیں۔ جین مذہب میں لکشمی پوجا کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ بھادوں کے مہینے میں جینی عورتیں ایک دن سے سات دن تک برت رکھتی ہیں، پانی سے کلی تک نہیں کرتیں۔ جینی عورت راہب تو بن سکتی ہے مگر اسے موکش حاصل نہیں ہو سکتا۔ موکش صرف مردوں کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جینی سبزی خوری میں بھی بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں تاکہ ان کا کھانا کیڑوں مکوڑوں سے محفوظ رہے۔ سوئتمبر فرقے کے راہب اپنے منہ کے سامنے ایک چھوٹی سی کوچی ہلاتے رہتے ہیں تاکہ فضا میں رہنے والے جراثیم ان کے منھ میں داخل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے منہ پر پٹی لگاتے ہیں۔ جینی برہمنوں اور راجپوتوں کے یہاں شادی نہیں کرتے کیوں کہ وہ اس سے چھوت چھات کرتے ہیں۔ جین مذہب تبلیغ کا بھی قائل نہیں۔ وہ پرندوں اور چیونٹیوں پر خاص طور سے نگاہ و توجہ رکھتے ہیں، تاکہ ان کی جان کا ضیاع نہ ہو۔

جین اور بدھ مت کا تعلق

ایک عرصے تک عام خیال یہ رہا کہ جین مت بدھ کی ایک شاخ ہے یا اس کے برعکس بدھ مت جین مت کی شاخ ہے۔ اگرچہ دونوں مذہبوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، لیکن کسی ایک کا دوسرے کی شاخ ہونے کا تصور اب بالکل فرسودہ ہو گیا ہے۔ دونوں ویدوں پر ایمان نہیں رکھتے، رسموں کی افادیت کے دونوں منکر ہیں، پرماتما کے سوال کو دونوں نے نظر انداز کیا ہے، پیدائش کی بنیاد پر امتیازات کی دونوں نے مذمت کی ہے۔ اہنسا کے اصول اور آئندہ زندگی میں کرم (اعمال) کے اثرات پر دونوں نے زور دیا ہے، دونوں مذہبوں نے رائج الوقت عقائد اور توہمات کے ساتھ رواداری برتی ہے۔ بے شک دونوں مذہبوں میں بڑی واضح مشابہت پائی جاتی ہے، لیکن بعض بنیادی مسائل میں ان کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ مثال کے طور پر بدھ مت کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے "انا" سے عاری ہے، جب کہ جین مت سکھاتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ ذی روح ہے۔ جین مت ریاضت اور نفس کشی کے تقدس کا قائل ہے۔ اس کے برعکس بدھا نے درمیانی راستہ اختیار کرنے اور زاہدانہ زندگی اور نفس پرستی کی حدوں سے بچ کر نکلنے کی تلقین کی ہے۔ نجات پانے سے متعلق بھی ان کے نظریات بالکل یکساں

نہیں ہیں۔ چوں کہ دونوں مذہب ایک ہی ملک اور ایک ہی عہد میں پیدا ہوئے، اس لیے ان میں یکساں خصوصیات کا پایا جانا غیر متوقع نہیں، لیکن اسی کے ساتھ اختلافات بھی اس قدر نمایاں ہیں کہ ان میں رقابت کا سلسلہ بھی کافی عرصے تک جاری رہا۔[۱۲۸]

جہاں تک دونوں مذاہب کے پھیلاؤ اور وسعت کا تعلق ہے تو بدھ مت کے ماننے والے کی تعداد اور اس کا حلقہ جین مت سے بہت وسیع ہے۔ وہ یقیناً عالمی مذاہب میں بلند مقام پر ہے اور اس مذہب نے یقیناً ہندو مذہب کی جڑوں کو کافی عرصے تک متزلزل کیا اور اس پر اپنے اثرات قائم رکھے، جب کہ جین مت نے نہ تو ہندو دھرم کو بہت زیادہ متاثر کیا اور نہ بدھ مذہب پر اپنا اثر ورسوخ قائم کیا، حالاں کہ دونوں مذہبوں کو حکومت وقت اور ہندو راجاؤں کی سرپرستی حاصل رہی۔ دونوں مذہبوں نے آریہ دھرم یا پھر برہمنی مت پر اپنا اثر ڈالا۔

اسلام کی آمد کے وقت ہندوستان میں کون سا مذہب رائج تھا؟

عروج وزوال کا الٰہی نظام ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ایک زمانے میں ویدک اور برہمنی مذہب ہندوستان پر غالب رہا، اس کو کم زور اور اپاہج بنانے کے لیے بدھ اور جین دھرم وجود میں آیا جو عرصے تک ہندوستان میں رائج اور غالب رہا، مگر وہ بھی اپنی لادینی اور بت پرستی کی وجہ سے مضبوط و مستحکم نہ ہو سکا اور بالآخر مغلوب ہو کر ہندوستان میں بہت کم لوگوں کا مذہب رہ گیا۔ دوبارہ جدید شکلوں میں ہندو دھرم کا احیا ہوا۔ جہاں تک راقم السطور کا گمان ہے کہ ہندو مذہب کے اندر الٰہی مذہب کی وہ روح نہ تھی جو عوام الناس کی رہ نمائی کر سکے۔ اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی ایسا مذہب رائج ہو جو تمام سابقہ تعلیمات پر کاری ضرب لگائے اور لوگوں کو صراط مستقیم کی رہ نمائی کرے۔ چناں چہ اس عروج وزوال کی حالت میں اسلام ہندوستان میں داخل ہوا اور بہت جلد اپنی حقیقی اور سچی تعلیمات کی بنا پر پورے ہندوستان میں چھا گیا اور جسے برہمنی مت، بدھ، جین اور دیگر مذاہب دیکھتے رہ گئے۔

اسلام کی ابتدا ہندوستان میں لگ بھگ ۱۵ھ میں ایک اتفاقیہ حملے کے ذریعے ہوئی۔ اس سے پہلے سندھ میں راجہ ساہسی کی حکومت تھی، جو بدھ مذہب کا پیرو تھا اور سندھ میں تمام آبادی بدھوں کی تھی۔ اس کے بعد چچ نامی شخص یہاں کا فرماں روا ہوا، جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ برہمنی مذہب کا پابند تھا، مگر حکومت کا مذہب بدھ مت ہی رہا؛ کیوں کہ وہ قربانی وغیرہ بدھ مندر میں جا کر کرتے تھے۔ راجہ چچ کے بعد چندر سندھ کا راجہ ہوا وہ بدھ مذہب کا سختی سے پابند اور برہمنی مذہب کا دشمن تھا۔

۱۲۸۔ نفس مصدر، ۱۳۱-۱۳۲۔

راجہ چچ کے زمانے میں ہیون سانگ (جو بدھ مذہب کا ماننے والا بڑا عالم تھا)ہندوستان آیا اور ایک روایت کے مطابق وہ ۲۸ھ تک ہندوستان میں رہا، اور ہندوستان کے چپے چپے کی سیر کرڈالی۔ چوں کہ مہاراجہ اشوک جو حضرت عیسیٰ مسیح سے ۲۶۵ سال قبل ہندوستان کا فرماں روا تھا، اس کے انتقال کے بعد بودھوں کی سلطنت چھوٹی چھوٹی ٹکریوں میں بٹ گئی اور بدھ کی اصل تعلیمات مسخ ہوگئیں اور بودھوں میں بہت سے فرقے پیدا ہوگئے تھے۔ ہر فرقے کی عبادت وعقائد مختلف تھے۔ خود ہیون سانگ کے بیان کے مطابق اس وقت بدھ مذہب اٹھارہ فرقوں میں منقسم تھا اور یہ لوگ آپس میں ایسی گرما گرمی سے مباحثہ کرتے تھے کہ ان کی آواز سمندر کی موجوں کے شور کی طرح دور سے آتی تھی۔ باوجود اس کے اس کا نام بدھ ہی تھا، اور لوگ بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں برہمنی مذہب رائج تھا۔ البتہ اس کے ماننے والے ضرور موجود تھے اور بقول اکبر شاہ نجیب آبادی:

انگریزوں نے اس عہد کو بدھسٹ یا بدھ نمالوگوں کا زمانہ کہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اچھے الفاظ میں اس زمانے کو لامذہبی زمانہ کہا جاسکتا ہے، کیوں کہ گوتم بدھ کی تعلیمات بہت کچھ مسخ ہوچکی تھیں، ویدوں کے مذہب کا زمانہ تو منومہاراج ہی کے زمانہ میں ختم ہوچکا تھا۔ کرشن مہاراجہ کی تعلیمات اور گیتا وغیرہ بھی مسخ ہوچکی تھیں۔ پران ابھی تصنیف ہی نہیں ہوئے تھے، کیوں کہ پرانوں کی تصنیف کا زمانہ آٹھویں صدی عیسوی کے بعد کا زمانہ ہے، جب کہ سندھ پر اسلامی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت ہندوستان کے مذہب کا اگر کوئی نام رکھا جاسکتا ہے تو وہ بدھ مذہب ہی ہوسکتا ہے۔[۱۲۹]

مگر یہ رائے بھی مکمل درست نہیں، بلکہ یہ کہا جائے کہ ہندوستان جس وقت اسلام میں داخل ہوا، اس وقت ہندوستان میں کئی مذاہب رائج تھے۔ کسی علاقے میں کوئی ایک مذہب کی جڑ مضبوط تھی تو دوسرے علاقے میں دوسرے مذہب کی۔ البتہ علاقۂ سندھ میں بحیثیت ہندو دھرم کے بدھ مذہب غالب تھا۔ جب کہ جنوبی ہند میں وشنو اور شیو کے پرستار زیادہ پائے جاتے تھے، اور کہیں کہیں جین ازم کا سکہ چلتا تھا۔ مختصر یہ کہ اسلام کئی مذاہب کے درمیان داخل ہوا اور سب پر اپنے مثبت اور مفید اثرات چھوڑتا ہوا ترقی کی منزل طے کرتا رہا۔

۱۲۹- اکبر شاہ نجیب آبادی، **آئینہ حقیقت نما** (مطبوعہ دیوبند، ۱۹۹۷ء)، ۸۶۔